حباب آوارۂ دیر و حرم رہتی ہے صدیوں تک

تو بزمِ عشق میں ہوتا ہے اک صاحبِ نظر پیدا

تذکرۃ الاعزاز

یعنی

سوانح حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب مدظلہ العالی

از قلم

سید محمد انظر شاہ کشمیری

(فاضل دیوبند)

ابن حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

ناشر

مکتبہ ابنائے علامہ انور شاہ۔ شاہ منزل دیوبند

اشاعت اول ایک ہزار

۱۹۵۳ء

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

قیمت (عہ)

انتساب

"ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلتا ہے۔" یہ صرف ایک ضرب المثل نہیں بلکہ واقعہ ہے، خاص دارالعلوم کی زندگی میں حضرت نانوتوی سے حضرت شیخ الہند جیسے بزرگوں نے کمالات علمی حاصل کیے۔ حضرت شیخ الہند سے حضرت مولانا انور شاہ حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی مدظلہ العالی، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہم نے تربیت پائی، حضرت مولانا انور شاہ صاحب کے شاگردوں میں حضرت مولانا محمد اعزاز علی صاحب حضرت مولانا فخرالدین صاحب مرادآبادی مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا محمد حفظ الرحمن سیوہاروی، مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی اور دوسرے سیکڑوں حضرات نے مرتبہ قیادت وسیادت پایا۔

حضرت مولانا اعزاز علی کا علم وکمال حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کے فیضان توجہ کا ثمرہ ہے اور میں ان گہرے علمی روابط کی مناسبت سے اپنی اس تحریر کو

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ صاحب

کے نام نامی اور اسم گرامی سے منسوب کرتا ہوں

مجھے امید ہے کہ بارگاہ انوری میں ان کے ایک لائق شاگرد کا یہ نامکمل سا تذکرۂ حیات قبول ہوگا

"سید محمد انظر شاہ"

ابتدائیہ

اگر طالب علم تعصب کے چشمے کو آنکھوں سے علیحدہ کرکے تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کرے تو اس کو معلوم ہو گا کہ مسلمانوں کی زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح ان کے نظام تعلیم و تربیت کی داستان بھی عبرت خیز و انگیز ہونے کے ساتھ بہت دلچسپ ہے۔ نظام تعلیم و تربیت کے سیکڑوں گوشوں کا جائزہ لینا پیش نہیں ہیں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ گذرے ہوئے زمانہ میں استاد و شاگرد کا باہمی تعلق کیسا مستحکم اور کس درجہ استوار تھا۔ اساتذہ کی حد سے بڑھی ہوئی شفقت نے طلباء کے قلب میں اپنے اساتذہ کی عظمت و احترام کے نقوش کس قدر گہرے کردیئے تھے اور غریب الدیار، شکستہ حال و پریشان بال طلباء کی ضروریات کی نگہداشت اور ان کے لئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے خیال نے اساتذہ کے دلوں میں اپنے شاگردوں کے لئے کیسا جذبۂ عاطفت و رافت پیدا کیا تھا۔ مسلمانوں کی تعلیمی زندگی سے متعلق تذکروں کا تتبع اگر صفحات تاریخ سے کیا جائے تو تاریخ کے بطون اوراق میں ایسے واقعات ایک دو نہیں بلکہ سینکڑوں ملیں گے جن سے استاد و شاگرد کے باہمی تعلقات پر ایک مبسوط اور کار آمد جامع والی تاریخ تیار کی جا سکتی ہے۔

تلامذہ و اساتذہ کے اس پرخلوص اور نہایت مستحکم تعلق سے کیا نتائج پیدا ہوتے تھے؟ اگر اس کا جائزہ لینا ہے تو آج ان تلخ نتائج پر نظر دوڑاؤ جو استاد و شاگرد کے باہمی تعلق کے ختم ہونے سے رونما ہو رہے ہیں۔ اگر آج کے نتائج تلخ ہیں تو اس کے بالمقابل سابق زمانہ میں پیدا ہونے والے ثمرات خوش آیند و خوشگوار ثابت ہوتے تھے۔ مختصر یہ کہ تعلقات باہمی کے اس رشتہ کے انقطاع سے تعلیم و تربیت کے نظام میں جو زبردست خلا پیدا ہو گیا اس کا اندمال صرف اسی رشتۂ خلوصِ تعلق کو از سر نو استوار اور مستحکم کرنے ہی سے ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ اس نقصانِ عظیم کی تلافی

کی کوئی اور راہ نہ تھی۔ گذرے ہوئے دور میں اساتذہ کا اپنے شاگردوں کے ساتھ شفقت و عنایت کا کیا عالم تھا؟ اس کا جواب تاریخ کے صفحات ہی دے سکتے ہیں کیونکہ مؤرخین علماء کے تذکروں میں ان کی دوسری خصوصیات کے ساتھ تلامذہ سے ان کی شفقتوں کا ذکر بھی تفصیل سے کرتے ہیں، مثلاً مولانا سعید سمرقندی کے حالات میں صاحب "تذکرہ علماء ہند" ان کی دوسری صفات و خصوصیات کے ساتھ یہ بھی لکھتے ہیں۔ کہ

"و شفیق بہ تلامذہ بود"۔ ص ۷۶

آپ دیکھ رہے ہیں کہ مؤرخ کی نظر میں ان کی دوسری صفات کے ذکر کے ساتھ یہ خصوصیت بھی عظیم الشان نتائج اور خوشگوار ثمرات پیدا کرنے کے اعتبار سے قابل ذکر تھی۔ اسی "تذکرہ علماء ہند" میں مولانا محمد مفتی جو بعہد اکبر اعظم لاہور میں منصب افتاء پر متعین کئے گئے تھے، ان کے حالات مؤرخ لکھتے لکھتے ہم کو یہ بھی سناتا ہے کہ

"ہر بارے کہ ختم صحیح بخاری و مشکوٰۃ المصابیح می کرد مجلس عظیم ترتیب دادے و طبخ لبخزا و حلویات می فرمود و بعلما، و صلحا، و طلبا رخوراندی غرض منزل وے مجمع اعیان و افاضل زماں بود" ص ۲۱۸

جب ختم صحیح بخاری یا مشکوٰۃ شریف کرتے تو ایک پُرتکلف دعوت پر علماء، صلحاء اور طلباء کو مدعو کرتے غرضیکہ ان کے مکان پر اس دور کے علماء و فضلاء کا ہجوم رہتا۔

اور آج کہ تعلیمی راہ میں ہر قسم کی سہولتوں کے میسّر آنے کی وجہ سے طلباء کے لئے درسی کتابوں کی فراہمی میں غریب اور شکستہ حال طلباء کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا؟ اس کا اندازہ اب کون کر سکتا ہے۔ بہر حال موجودہ وقت میں۔ یونیورسٹیوں۔ کالجوں اور دینی مدارس میں پڑھنے والے طلباء اگر تاریخ کے صفحات الٹ پھیر کر دیکھیں تو ان کو معلوم ہو کہ ضروری کتب کی فراہمی ان اوقات میں کس قدر دشوار تھی۔ اساتذہ نے اپنے اس غیر معمولی جذبۂ شفقت و

عنایت سے متأثر ہو کر جو طلباء کے لئے ان کے قلب میں پیدا کر دیا گیا تھا۔ اس مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کیا راہیں تجویز کیں تھیں؟ اسی کی جانب فقیر ایک اجمالی اشارہ کرنا چاہتا ہے صاحبِ تذکرہ علماء ہند نے شیخ معین کے تذکرہ میں جو اکبر کی طرف سے لاہور میں محکمۂ قضاء کے افسر اعلیٰ بنائے گئے تھے لکھا ہے کہ

"ہموارہ کتب نفیسہ قیمتی می نویسانیدو آنرا مقابلہ نمودہ ومجلد ساختہ بطالب علماں می بخشید" صـ ۲۲۸

ہمیشہ قیمتی، نایاب اور نادر کتابوں کو اپنے صرف پر لکھواتے صحیح نسخوں سے مقابلہ کرتے اور جلد بندی کرانے کے بعد طلباء کو دیتے۔

شیخ صاحب کی شفقت وعنایت کا یہ مظاہرہ ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ یہ شغل عمر بھر باقی رہا صاحبِ تذکرہ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"مدت عمرش دریں کار بسر شد وہزار ہا مجلد ازیں قبیل بمردم بخشید" صـ ۲۲۸

جس کا مطلب یہی ہوا کہ شیخ معین کی یہ روش تا آخر عمر تک باقی رہی اور اس طرح سے ہزارہا قیمتی اور نایاب کتابیں شیخ صاحب سے طلباء تک پہنچیں اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ تاریخ کے صفحات میں ہم کو ایسی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں کہ کسی اجرت وعوض کے بغیر تعلیم وتدریس کے ساتھ اساتذہ نے اپنی تمام زندگی کا اندوختہ، مال ومتاع، طلباء پر صرف کر ڈالا اسی تذکرۂ علماءِ ہند میں ملا علاؤالدین کی تابناک زندگی اور پاکیزہ حیات کے متعلق یہ جامع الفاظ لکھتے ہوئے کہ ایک طویل عرصہ تک عبدالرحیم خانخاناں کی محفل علم میں معزز اور باوقار زندگی گذارنے کے بعد جب اکبر اعظم کے دربار میں پہنچے تو وہاں بھی اپنے غیر معمولی علم وفضل کی بناء پر ہزارہا احترام واعزاز کے مستحق گردانے گئے۔ اکبر نے بصد اصرار ملا صاحب کو سپاہ گری کا منصب

عطا کرنا چاہا لیکن اس مرد خدا نے اکبر کی اس پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے

"بدرس و افادہ مشغول ماند"   درس و تدریس کے شغل کو اپنے لئے مناسب سمجھا

اس کے بعد آگے لکھتے ہیں کہ

"ہرچہ از جاگیر حاصل می شد ہمہ صرفِ طلباءِ مبیکرد" صہ۱۴   جو کچھ جاگیر سے حاصل ہوتا تمام کا تمام طلباء پر صرف کر ڈالتے۔

بلکہ اگر دیکھا جائے تو اساتذہ کے ایثار اور ان کی طلباء کے ساتھ بے پناہ شفقتوں کی داستان اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ملا صاحب کے متعلق تو صاحبِ تذکرہ کی اس شہادت سے صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ وہ اپنی جاگیر سے حاصل شدہ تمام پونجی کو طلباء کی ضروریات میں خرچ کرتے لیکن اس سے بڑھکر یہ بھی سنیئے کہ اساتذہ نے طعام و قیام میں بھی طلباء کی دلداری و دلجوئی کی خاطر اشتراک کیا تھا اور باوجود ہر قسم کی آسائش اور سامان معیشت کے مہیا ہونے کے وہ بھی طلباء کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھکر سوکھی روکھی روٹی پر قناعت کرتے۔ حکیم الملک گیلانی جو بلا شبہ اپنے وقت کے جالینوس تھے ان کے اوصاف حمیدہ کے ساتھ ساتھ یہ بھی مذکور ہے کہ

"پیوستہ طلباء را درس گفتے و بے ایشاں طعام نہ خوردے" تذکرہ صہ۱۵   ہمیشہ طلباء کو درس دیتے اور ان کے بغیر کھانا تک نہ کھاتے۔

اور آج جبکہ استاد و شاگرد کا یہ باہمی تعلق نہ صرف مضمحل بلکہ تقریباً ختم ہو چکا ہے تو مولانا آزاد بلگرامی کی اس روایت پر کون یقین کر سکے گا جو انھوں نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "ماثر الکرام" میں ہم کو سنائی ہے کہ ملا محمود جونپوری صاحب "شمس بازغہ" نے عالمِ شباب میں اس دار فانی کو خیر باد کہا۔ سانحہ موت کی اطلاع ان کے استاذ مولانا محمد افضل کو پہنچی تو اپنے لائق اور عزیز ترین شاگرد کی موت کی خبر پاکر ان پر کیا گذری؟ اس کا جواب ماثر الکرام کی

اس دردانگیز عبارت سے ملیگا۔ لکھا ہے کہ

"تا چہل روز استاذ را کسے بہ تبسم نہ دید و بعد چہل روز استاد بہ شاگرد ملحق شد۔"

یعنی شاگرد کی موت کی اطلاع پاکر چالیس روز تک مولانا افضل کو کسی شخص نے متبسم نہ دیکھا اور آخر عزیز تلمیذ کا یہ روح فرسا المیہ ہی مولانا کے لئے جانگسل ثابت ہوا۔ یعنی چالیس روز کے بعد مولانا بھی اپنے شاگرد سے جا ملے۔ تاریخ کے صفحات میں ان منتشر اور بکھرے ہوئے واقعات پر وہ دل و دماغ کیونکر یقین کر سکیں گے، جن کو باہمی تعلقات کے بجائے باہمی آویزشوں کی مسموم اور مہلک ہواؤں نے متاثر کر رکھا ہے۔ بہر حال تواریخ کے صفحات میں نظام تعلیم و تربیت سے متعلق استاذ و شاگرد کے باہمی تعلقات کی یہ تفصیل اور مسلسل تذکرے ہم کو یقین دلاتے ہیں کہ مؤرخین کے قلم سے نکلے ہوئے یہ جملے حقیقت و واقعیت پر مبنی ہیں۔

اساتذہ کی اس بے پناہ شفقت سے طلباء کے قلوب میں ان کے لئے بے پناہ جذبۂ احترام و عقیدت اور بے پایاں تعلق و خلوص لازمی طور پر پیدا ہوتا۔ یہ تصویر کا دوسرا رُخ ہے، ضرورت تھی کہ تصویر کے اس دوسرے رُخ کو بھی نمایاں کیا جائے لیکن طوالت کے خوف سے بحث کے اس دوسرے پہلو کو مجبوراً قلم انداز کرنا پڑ رہا ہے۔ عرض کرنا یہ ہے کہ اس گئے گذرے ہیں دور میں حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب کی ذات گرامی کو ایک ظلوم و جہول انھیں روایات پارینہ اور اسلاف کی خصوصیات کا حامل پا رہا ہے۔

استاذ محترم کی شفقت و عنایت نے اُن سے استفادہ کرنے والے طلباء کے دلوں میں جو محبت و عظمت کا ایک لافانی جذبہ اور انمٹ نقوش مرتسم کر دیئے ہیں، انھیں کے نتیجہ میں یہ چند شکستہ آوازیں صفحۂ کاغذ پر ان کے ہیچ مداں شاگرد کے دل سے اٹھکر نمودار ہو رہی ہیں کسی نے کہا ہے کہ ؎

از صدائے سخن عشق نہ دیدم خوش تر
یادگارے کہ دریں گنبد دوّار بماند

اگر یہ صحیح ہے تو پھر استاذ محترم کی ذاتِ گرامی سے خاکسار کو جو تعلق ہے اسی کی پیدا کردہ یہ آوازیں گنبد دوّار میں شاید ہمیشہ سنی جاسکیں۔

میں جانتا ہوں کہ مولانا کی بارگاہِ عالی میں، میں اپنے اس "ارتکاب جرم" پر ان کی نظری شرافت اور نام و نمود سے گریز کی بنا پر مجرم گردانا جاؤں گا۔ اور عجب نہیں کہ مولانا کی خمول پسند طبیعت اور عزلت نشین مزاج اپنی تشہیر کی ان اداؤں کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھ سکے لیکن ایک ہیچ میرزا اپنی جگہ ان بے مایہ کوششوں پر مسرور و شاداں ہے اس لئے کہ ؎

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ "کارے کردم"

کتاب میں ہر حیثیت سے جو خامیاں رہ گئیں ہیں ان کا احساس شدید طور پر اپنے قلب میں پاتا ہوں لیکن ارباب نظر سے گذارش ہے کہ اگر میری خامیاں نظر آئیں تو عفو و صفح سے کام لیتے ہوئے اپنے اخلاق کریمانہ کا ایک اچھا ثبوت پیش کریں۔

اپنی اس سادہ دگی پر کیا عرض کروں کہ خطاؤں کے اس طومار کے باوجود آفریں و تحسین کا متوقع ہوں کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ ؎

مرا بسادہ دلیہائے من تواں بخشید
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

سید محمد انظر شاہ کشمیری ۱۳؍ ذی الحجہ ۱۳۷۷ھ

مدرس دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کچھ اپنے متعلق

نہ پوچھ حال مرا، وہ چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ جسے کارواں روانہ ہوا

ایک گم کردہ منزل، سرگشتہ و پریشان، جس کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہو کہ السنہ شرقیہ کے دو چار امتحان جلد دیکر انگریزی زبان سے اتنی واقفیت حاصل کرلے جو اس کو کسی دفتری ملازمت تک پہونچا کر معاشی مسائل کی الجھنوں سے نجات دلائے۔ وہ اچانک علوم دینیہ کی طرف کیونکر متوجہ ہوگیا؟

اسی ذہنی الجھن کا جواب دینا چاہتا ہوں تو تفصیلات کا ایک وسیع باب سامنے آجاتا ہے، حالانکہ میرا مقصد اس وقت ان تفصیلات کو بیان کرنا نہیں ع

کبھی فرصت میں سن لینا بڑی ہے داستاں میری

لیکن میری مختصر سی زندگی کا یہ وہ باب ہے کہ اگر آج اپنی زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کردوں تو کہہ سکتا ہوں کہ زندگی اپنا نصف حصہ وہاں ختم کرچکی تھی جہاں پہ علوم السنہ شرقیہ کا کتابی دور ختم ہوتا ہے اور ناکام زندگی اپنا قدم اس جگہ سے آگے بڑھاتی ہے کہ جہاں سے علوم عربیہ کی تحصیل کا آغاز وابتدا ہوتی ہے۔ اس لئے زندگی کی اس بدلتی ہوئی شاہ راہ پر کچھ لکھے بغیر قلم کو آگے بڑھا دینا میری زندگی میں آئے ہوئے ایک بڑے انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی پر سر خاموشی کے ساتھ گذر جانا ہے۔ اگر سوانح نگار کا فرض ہے کہ وہ پیش آئے ہوئے چھوٹے،

بڑے تمام واقعات کبلا کم و کاست بیان کرے تو پھر ایسے واقعات سے کیونکر صرفِ نظر کی جاسکتی ہے جو ہدئی ہوئی زندگی کا عنوان اور ایک نئی زندگی کا سنگ ِ بنیاد ہیں۔ اس لئے ان واقعات کو مختصراً بیان کرنے کے بعد اپنے محبوب و محترم استاذ کا ذکر شروع کرونگا کہ ان صفحات کی تسوید سے اپنے اسی مکرم مربی کا ذکر مقصود ہے، غالباً یہاں میرے تحت الشعور یہ جذبہ بھی کارفرما ہو کہ ایک مبارک و سعید شخصیت اور علمی زندگی کے ذکر کے ساتھ مجھ ایسے ظلوم وجہول کا بھی تذکرہ ہو جائے کہ میرے لئے یہی فخر و امتیاز کا باعث ہوگا۔ ؏

بلبل ہمیں کہ قافیہ گُل شود بس است

یہ ظلوم وجہول، ناکارہ و نالائق آج اس اظہار میں بھی ندامت محسوس کرتا ہے کہ اس سیاہ کار و سیاہ باطن کا تعلق ایک خانوادہ علم و فضل اور گہوارۂ زہد و تقویٰ سے ہے اس لئے کہ آبا و اجداد کے کارناموں پر فخر کرنا اور خاندان و قبیلہ کے فضل و کمال پر تفاخر دہانا لیکن اپنی بے بضاعتی و ہیچ میرزی ان کے سرمایۂ علم و عمل سے دور کی نسبت بھی نہ رکھتی ہو کھلی ہوئی حماقت یا پھر ایک بڑا اخلاقی جرم ہے۔ ہاں اگر ہماری عملی جدوجہد اور بے داغ زندگی ہم کو ان سے قریب کردے تو ہمارا پیوند ان کی زندگی کے دامن کے ساتھ کچھ مناسب معلوم ہوگا اور ایسا نہیں تو پھر ان افسانوں و قصوں کو سنانا ایک بے سود فعل اور لاطائل عمل ہے۔

حال پر اجداد و آبا کے تفاخر کیا امیر ؎

ہیں وہ ناداں جنکو ہیں قصوں کہانی کا گھمنڈ

تاہم بطور تحدیث نعمت اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ مبداء فیاض اور عالم کے پالنہار کا اس عاجز پر ایک ایسا فضل و کرم تھا کہ جس کے شکر کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا سخت مشکل ہے، ایک خانوادہ علمی میں پیدا کرنا اور خالص علمی ماحول میں آنکھ کھولنے

کی وجہ سے علم سے طبعی مناسبت اور فضل وکمال کے اکتساب کا بے پناہ جذبہ غالباً اس پیدا ہونے والے کا فطری جذبہ ہے کہ جو اس کی فطرت میں ودیعت رکھدیا جاتا ہے اب آئندہ زندگی میں اگر وہ اپنی ان فطری صلاحیتوں اور خاندانی مناسبت سے کام لے تو بہت کچھ آگے بڑھ سکتا ہے اور اگر قوائے عملی کو معطل کردے تو اس کا ہبوط بھی دوسروں کے مقابل میں نہایت ہی حیرت انگیز ہوتا ہے۔

افسوس کہ آج کہنا پڑتا ہے کہ اس روسیاہ نے اپنے خاندانی انفرادیت کو باقی نہ رکھا اور آج ہمارا دامن زندگی فضل و کمال کے اس متاع سے یکسر خالی ہے جو ہمارے لئے امتیاز و افتخار کا باعث تھی۔ اپنی ان کوتاہیوں کی بنا پر اپنی خاندانی خصوصیات سے دستبرداری کا اعلان اپنا اخلاقی فریضہ تصور کرتا ہوں اس لئے کہ ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو	پھر پسر قابل میراث پدر کیونکر ہو

اگر ہم اپنی ان کوتاہیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں تو یہ کوشش ، ناکام کوشش ہوگی۔ اس لئے کہ اپنی بے مائیگی ذہنی دامنی اس امر کا چیخ چیخ کر اعلان کررہی ہے کہ تم کو اپنے آباو اجداد سے کوئی مناسبت نہیں ہے ؎

تم ہو گفتار سراپا۔ وہ سراپا کردار

بہرحال ایک بدنام کنندہ نکونامے چند ، جب کچھ ہوش و آگہی کی زندگی میں داخل ہوا اور سوجھ بوجھ کی قوتیں اس میں عام طور پر پائی جانے لگیں ، تو خاندان کے ذمہ دار لوگوں نے اس کو "دارالعلوم دیوبند" کے شعبۂ فارسی میں داخل کرادیا۔ پانچ سال کے عرصہ میں اس شعبہ کی تکمیل برائے نام ضرور حاصل کرلی گئی ، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تیرہ بختی نے یہاں پر بھی ساتھ نہ چھوڑا قسمت کی داتا گونی یہاں سے بھی خالی ہی دامن لے چلی ،

مجھکو اس مقام پر اس کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ فارسی سے ظاہری تکمیل اور برائے نام فراغت کا سب سے قوی باعث میرے مرحوم بھائی "سید محمد اکبر شاہ" کی پر خلوص کوششوں کا نتیجہ تھیں۔ مرحوم بھائی اپنی فطری ذکاوت و ذہانت خدا داد صلاحیت، علم سے طبعی ذوق و شوق کی بنا پر واقعی اپنے اسلاف کا صحیح جانشین تھا بچپن میں اس کے اکتسابِ علم و فضل کی بے پناہ شوق و اشتیاق کو دیکھکر دوربین نگاہیں اس کے شاندار و تابناک مستقبل کا فیصلہ کرتی تھیں سے

بالائے سرش ز ہوشمندی   می تافت ستارہ بلندی

لیکن موت کے ظالم ہاتھوں نے اس نوخیز و نوعمر شاب صالح کی زندگی ختم کر ڈالی ع

بس غنچہ ناشگفتہ بتاراج خزاں رفت

اور اس کی موت پر ایک ایسی طالب علمانہ زندگی کا اختتام ہو گیا کہ جس سے ہزارہا توقعات قائم اور وابستہ تھیں۔ تغمدہ اللہ بغفرانہ۔

عزیز بھائی کے ناگاہ سانحہ ارتحال پر جبکہ تمام گھر، خصوصاً والدہ محترمہ تصویر غم بنی ہوئی تھیں، اِس سیاہ قسمت کو لایعنی مشاغل اور لہو و لعب میں مشغول رہنے کا قدرتی موقع مل گیا، اور اس کے نتیجہ میں علمی زندگی میں فطرت کا یہ زمانہ اس قدر طویل ہوا کہ یہ خاکسار اب کہ علوم عربیہ کی تکمیل میں مشغول ہے تو درجہ فارسی کے بہت سے رفیقِ سبق اور شریکِ درس آج دارالعلوم دیوبند میں درس و تدریس کی اہم ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے ہیں، میری درماندگی و حسرت اپنے ان ساتھیوں کو زندگی کے میدان میں جب تیز قدم اٹھاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو بے اختیار چیخ اٹھتی ہیں کہ سے

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا   ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

اور پھر بزمانہ فترت، یا علمی زندگی میں ناسازگار اور ماحول کی پیدا کردہ بدشوقی کا اثر تقریبًا چار پانچ سال تک اپنا کام کرتا رہا ہیہات کہ عمر کا یہ عزیز ترین اور گرانمایہ حصہ، خالص لہو ولعب، بے ہودہ مشاغل، بے کار صبح وشام کے نظر ہو گیا۔ میری اس وقت کی لاطائل زندگی، اور لایعنی مشاغل سے واسطہ دیکھکر میری زبوں حالی پر وہ آنکھیں روتیں کہ جن کے قلب خلوص سے لبریز تھے، میرے ان بے مصرف اوقات پر وہ دل کڑھتے کہ جن دلوں میں میرے تعلق کی حرارت اور گرمی موجود تھی، اگر اس حالت میں مجھکو کوئی دیکھتا تو میرے تاریک مستقبل کی خبر دیتا اور دیکھنے والے کو میری سیاہ بختی و تیرہ قسمتی کا یقین ہو جاتا ؎

ادراک حال ماز نگہ می تواں نمود
لختے زحال خویش بسیما نوشتہ ایم

لیکن یہاں پر یہ پیش نظر رہے کہ اگرچہ فاسد ماحول نے علمی زندگی کے اختیار کرنے سے روک دیا تھا لیکن الحمد للہ کسی اخلاقی کمزوری میں اس ماحول کے اثرات نے کبھی مبتلا نہیں کیا بعض مصنفین کی طرح یہ دعویٰ نہیں کر سکتا "کہ گناہ کی کوئی گھاٹی ایسی نہیں جس میں میرے قدم نہ پہنچے ہوں" بہرحال گرانمایہ اوقات کا ایک معتد بہ حصہ اس طرح ضائع کرنے کے بعد تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا، لیکن تعلیم و تعلم کے ایک طویل عرصہ کی دوری نے طبیعت کو اس قدر جامد، اور حصول علم کے جذبہ سے مجھکو اس قدر محروم کر دیا تھا کہ اس کے بعد طبیعت پڑھنے پر آمادہ ہوتی اور نہ قلب میں اس قسم کا کوئی داعیہ نظر آتا، تاہم چند بزرگوں کی سعی و کوشش سے دارالعلوم کے ایک کہنہ مشق استاذ مولانا قاری اصغر علی صاحب (جن کا مختصر سا ذکر آئندہ صفحات میں آتا ہے)، کی درس گاہ تربیت میں پہنچا دیا ؎

مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

استاذ موصوف کے سامنے عربی کی پہلی کتاب، درس نظامی سے متعلق اولین صحیفہ یعنی "میزان الصرف" شروع کی گئی، یہ ہمارے محترم استاذ قاری صاحب کی کرامت کہئے یا انکے طرز تعلیم کی جودت کہ چند ہی ایام میں طبیعت کا جمود ختم ہوگیا اور خاکستر شدہ صلاحیتیں ازسرنو بروئے کار آنے لگیں، اور ایک ایسے انسان کو جو اپنے سے خود بھی مایوس ہوچکا تھا اور دیکھنے والے بھی اس کی مایوس کن و یاس انگیز حالت کو دیکھکر سراپا یاس وحسرت بنے ہوئے تھے؛ شفیق استاذ کی شفقت اور پرخلوص جدوجہد کے نتیجہ میں اپنے اندر یہ حیرت انگیز تبدیلی پاکر کہنا پڑتا ہے کہ ؎

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کرسکتی ہے انداز گلستاں پیدا

پوری محنت وشوق کامل کے ساتھ میزان الصرف ختم ہونے کے قریب پہنچی تو بدقسمتی سے اسی زمانہ میں مرادآباد سے ایک صاحب دیوبند آکر شریک درس ہوئے، یہ صاحب اپنی بدشوقی اور پڑھنے پڑھانے سے جی چرانے میں مشہور تھے، ادھر میری صلاحیتیں روز بروز ترقی کرتی جاتیں اور سبق کے محفوظ کرنے اور اس کو سمجھکر ذہن نشین کرنے میں احقر تمام جماعت میں غالب اور اول رہتا، اور ان صاحب کو بھری درس گاہ میں تمام طلباء کے مقابل میں عموماً اور خاکسار کے مقابلہ میں بالخصوص روزانہ شرمندہ ہونا پڑتا نتیجہ کے طور پر حسد وعناد کا جذبہ مولوی صاحب موصوف کے قلب میں پیدا ہوا، اور میرے اندر بدشوقی پیدا کرنے کیلئے یہ صاحب تیار ہوگئے ع

آشنیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا

یہ داستان بڑی طویل ہے اور نہایت تلخ۔ مختصر یہ کہ ان صاحب کی "کرم فرمائی"

کے نتیجہ میں اس تیرہ بخت، ناکام روزگار، کو ایک کامل استاذ و مشفق مربّی کی درسگاہ سے بھی تہی دامن نکلنا پڑا، اپنی اس حرماں نصیبی اور محرومی قسمت پر کہنا پڑتا ہے ع

کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

شومیٔ قسمت سے عربی کی ابتدائی تعلیم کا سلسلہ جو بہت ہی خوشگوار تمناؤں کے ساتھ شروع ہوا تھا اس حسرتناک انجام پر ختم ہوگیا اور درمیان میں ایک دو ماہ کے نہایت ہی قلیل وقفہ کے بعد پھر وہی صبح وشام شروع ہوگئیں جن کو میرے ذمہ دار تعلیمی زندگی کے لئے مہلک اور تباہ کن تصور کرتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ان کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ دیو بند میں مکان پر رہ کر اس کی تعلیم ناممکن ہے۔ اس لئے دیو بند سے باہر کہیں بھیجنے کی تجویز سامنے آئی۔ اسی زمانہ میں میرے خالہ زاد بھائی حکیم سید محمد اختر حسین صاحب بسلسلہ ملازمت دلی مقیم تھے وہ آگے بڑھے اور خاندان والوں کو اس پر آمادہ تیار کر لیا کہ مجھکو دہلی بھیجدیا جائے، محترم بھائی کی شخصیت ہم سب کے لئے اور خصوصاً میرے لئے انتہائی مرعوب کن تھی۔ ان کا پُر ہیبت و جلال چہرہ، خشم آگیں و قہر آلود نگاہیں، پڑھنے پڑھانے کے معاملہ میں ان کی سخت گیری کے احساس نے دہلی کا سفر اور وہاں ان کی نگرانی و زیر تربیت قیام میرے لئے قابل غور مسئلہ بنا دیا اور ابتداً دہلی کا سفر کرنے میں مجھکو بے حد تامل ہوا۔

لیکن والدہ محترمہ کے اصرار اور ادھر خود اپنی اضاعتِ عمر و تضییع اوقات کے خیال نے اس سفر پر تیار کر دیا۔ ایک ایسا شخص جسنے اپنی عمر کا بڑا حصہ لہو و لعب کے نذر کر دیا تھا اور جس کی مختصر سی زندگی کے گراں قدر اوقات برباد ہو چکے تھے مکان پر رہ کر ہر قسم کی آسانی اور سہولت ہونے کے باوجود ایک لفظ بھی صحیح معنیٰ

میں نہ بڑھ سکا، اس کا یہ ارادہ کہ دہلی کا سفر۔ بسلسلۂ حصول تعلیم کیا جائے ہر شخص کے لئے حیران کن تھا جو سنتا بے اختیار کہتا ؎

مومن تم اور عشق بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے
یہ ذکر اور منہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

لوگوں کے اپنے متعلق یہ تاثرات پا کر خود مجھ پر بھی مایوسی طاری ہوتی لیکن یاس و ناامیدی کے عالم میں خیال آجاتا کہ ؏

عالم یاس میں گھبرائے نہ انسان بہت

ٹوٹی ہوئی ہمتیں بندھتیں، اور دل کو کچھ ڈھارس ہوتی۔ غرضیکہ ایک ظلوم و جہول اپنی جہالتوں کا تمام پشتارہ پیٹھ پر اٹھائے ہوئے اس دہلی کی جانب روانہ ہو گیا جس کے متعلق کہا گیا ہے۔ ؎

سرزمین دلی کی مسجود دل غمدیدہ ہے
ذرہ ذرہ میں لہو اسلاف کا خوابیدہ ہے

دہلی پہنچنے کے بعد برادر بزرگوار نے تعلیم کا نقشہ کچھ اس طرح سے بنایا کہ دو چار یونیورسٹی سے السنہ شرقیہ کے امتحان دیکر انگریزی کی طرف توجہ کی جائے محترم بھائی نے تعلیم کا جو یہ خاکہ تیار کیا تو اس میں جدید اور وقتی نقاضوں کی رعایت کے ساتھ یہ خیال بھی کارفرما تھا کہ اب اس کی عمر بظاہر اس قابل نہیں رہی کہ آٹھ دس سال درس نظامی کے حصول میں لگا دیئے جائیں، اسی خیال کے پیش نظر جلد از جلد امتحانات کی تیاری شروع کرادی گئی۔ غالباً سب سے پہلا امتحان فارسی کا تھا جس کی تیاری میں صرف برادر محترم کی مرعوب کن شخصیت نے کام کیا ورنہ ایک دو ماہ

کے قلیل عرصہ میں یونیورسٹی کے کسی امتحان کی تیاری کم از کم مجھ ا یسے ہیچ میرز کے لئے کافی مشکلات کا باعث تھی۔

خاکسار ابھی دہلی میں یونیورسٹی کے یکے بعد دیگرے امتحان دے رہا تھا کہ اچانک ہند و پاکستان کی تقسیم کے نتیجہ میں ہندوستان کی زمین پر وہ خونی انقلاب آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، فسادات کا یہ خونی سیلاب پنجاب کی حدود توڑ کر دہلی کی جانب بڑھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دہلی کی پرسکون زندگی خطرات سے گھر گئی، اور وہی دہلی کہ جس کا ایک ایک گوشہ دنیا کی وسعتوں کو اپنے اندر سمائے ہوئے تھا، بربریت وبہیمیت کے ہاتھوں اس حالت کو پہنچا کہ وہ آنکھ جس نے پہلی دہلی کی سیر کی تھی آج تباہ و اجڑی ہوئی دہلی کو دیکھکر بے اختیار کہہ اٹھتی ؎

جائیکہ بود آں دلستاں۔ در بوستاں با دوستاں
شد زاغ و کرگس را مکاں۔ شد مرغ و ماہی را وطن

مختصر یہ کہ ۱۹۴۷ء میں دہلی کی زمین پر جو طوفانی بھونچال آیا اس سے دہلی کا تمدن اور ساری زندگی اجڑ گئی، تاآں کہ وہاں کی علمی زندگی بھی آندھیوں کے ان زبردست جھکڑوں سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکی، علمی مجلسیں اکھڑ گئیں، مدارس ویران ہو گئے، پڑھنے پڑھانے والے سب تتر بتر ہو گئے، حالات روز بروز خراب سے خراب تر ہوتے چلے جاتے اور یہاں کی نازک حالت کی خبر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ رہی تھی کہ عین کشمکش کی انہیں کٹھن گھڑیوں میں والدہ محترمہ کا حکم نامہ ملا کہ "تم جلد دیوبند چلے آؤ" حالات کے سنبھل جانے اور فضا کے صاف ہو جانے پر پھر جا سکتے ہو" والدہ محترمہ کے اس حکم کی تعمیل ضروری تھی اس لیے یہ خاکسار دیوبند میں دہلی کے اطمینان بخش حالات کا انتظار

کرنے کے لئے آ بیٹھا۔

دیوبند میں چند روز قیام کرنے کے بعد اچانک قلب میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس مدت کو کیوں بیکار جانے دیا جائے، کچھ عربی ہی پڑھ لی جائے تاکہ السنہ شرقیہ کے بعض امتحانات میں عربی کی جو کتابیں رکھدی جاتی ہیں اور وہ عربی سے ناواقف طلبار کیلئے سخت پریشانی کا باعث بنجاتی ہیں اُن کے پڑھنے میں سہولت و آسانی ہو جائے گی۔ یہ خیال جس سرعت کے ساتھ قلب میں پیدا ہوا اتنی ہی تیز رفتاری سے اس کی تکمیل بھی کی گئی۔

آج اگر اس وقت کے خیالات و جذبات پر غور کرتا ہوں اور عربی پڑھنے کا جس طریقہ سے قلب میں خیال پیدا ہوا اور پھر آئندہ کے مراحل جس تیزی سے خودبخود طے ہوتے چلے گئے تو سوائے اس کے کہ اس کو لطیفۂ غیبی کہوں اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ ؎

کار زلف تست مشک افشانی۔ اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند

درس نظامی کی ابتدا کس ارادے کو لے کر کی گئی، اور آخر میں کیا کچھ پیش آیا اور وہی کہ جس کو ایک وقتی مشغلہ کی حیثیت سے شروع کر دیا گیا تھا۔ آج اپنا مستقل شغل ہو کر رہ گیا، خیالات و حالات کے ان الٹ پھیر پر اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ۔ ؎

ہوس سے ہم نے کیا تھا عشق اول
وہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا

بظاہر ہندوستان کا یہ خونیں انقلاب، اور نظام امن و عافیت کی درہمی برہمی کا نہایت ہی ہولناک سلسلہ کم از کم میرے حق میں تو فال خیر ہی رہا۔ ع

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

فسادات کے اس خوفناک سلسلہ کو اپنے حق میں جب خوش آیند کہتا ہوں۔ تو سعدی شیرازی کی بوستاں والی وہ حکایت بے اختیار یاد آجاتی ہے کہ بغداد میں ایک رات نہایت خوفناک اور جلاکر بھسم کر دینے والی آگ لگی ہوئی تھی، لوگوں کے مال و متاع جل، جلکر خاکستر ہوئے جاتے تھے، عین اسی عالم میں ایک سبک سر و خفیف العقل کھڑے کہہ رہے تھے کہ ع

دکان مارا گزندے نبود

میرا یہ تصور اگرچہ بڑا انسانیت سوز ہے لیکن جو کچھ پیش آیا اور جس طرح سے پیش آیا اس کے کہنے پر مجبور ہوں۔ مختصر یہ کہ عربی و دینی علوم کی طرف اچانک متوجہ ہونے کا یہ ظاہری سبب ہے، اس کے علاوہ ایک اور سبب ہے جس کو لطیف کریم کا لطف خفی سمجھتا ہوں۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ علمی خانوادے سے تعلق ہونے کی وجہ سے علمی ماحول تک رسائی طبقۂ اول کے علماء سے تعارف کی راہیں مجھ پر کھلی ہوئی تھیں۔ اپنی تمام جہالتوں کے باوجود ان لوگوں کی علمی مجالس میں بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتا۔ ؎

گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

دہلی میں ایک مرکزی ادارہ تھا جس کا نام "ادارۂ شرقیہ" تھا یہ ادارہ مولانا ادریس صاحب میرٹھی کا قائم کیا ہوا ہے سیکڑوں طلباء ہر سال اس ادارہ کی معرفت

پنجاب یونیورسٹی سے السنہ شرقیہ کے امتحانات کی تیاری کرتے تھے، مولانا موصوف دیوبند کے فاضل اور بڑے مستعد آدمی تھے اس وقت دہلی میں دار العلوم دیوبند کے نامی گرامی فضلاء کی ایک بڑی جماعت موجود تھی، یہ تمام لوگ دہلی کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے تھے، آپس میں ملنا، جلنا دہلی کی زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون سہل نہیں تھا، سب نے ملکر اس صورت حال پر غور کرنے کے بعد طے کیا کہ آپس میں ربط و اتحاد باقی رکھنے کے لئے ہفتہ میں ایک روز ملاقات کرنا ضروری ہے، اس تجویز کے سامنے آنے کے بعد اجتماع کے لئے کسی مناسب جگہ و موقع کی تلاش ہوئی "ادارہ شرقیہ" کیونکہ جامع مسجد دہلی سے بالکل قریب واقع ہوا تھا اور جمعہ کے دن دوگانہ کی ادائیگی کے لئے جامع مسجد ہر شخص پہنچتا تھا، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ادارۂ شرقیہ کی عمارت میں سب پہنچ جایا کریں، یہ اجتماع برابر ہوتا اور سب شریک ہوتے، علمی بحثیں، سیاسی مسائل، مذہبی معاملات پر عالمانہ انداز میں گفتگو ہوا کرتی، شرکاء میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب ناظم اعلیٰ جمیعۃ العلماء ہند، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی، مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کے علاوہ دہلی میں جمعہ کے روز موجود رہنے والا اور جماعت سے تعلق رکھنے والا ہر ادنیٰ و اعلیٰ شخص پہنچتا

اسی زمانہ میں مجذوب سندھی مولانا عبید اللہ صاحب سندھی مرحوم "جامعہ ملیہ" دہلی میں غالباً تفسیر کا درس اپنے مخصوص انداز میں دے رہے تھے اور اس سلسلہ میں ان کا قیام دہلی ہی میں تھا، ایک دن ایسا ہوا کہ جمعہ کو معمول کے مطابق ادارہ کی عمارت میں اجتماع تھا اور سب شریک تھے، غالباً مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کسی سیاسی موضوع پر بول رہے تھے کہ دفعتہً مولانا سندھی مرحوم سر و پا برہنہ کاندھے پر ایک کھادی کی چادر، گریبان

کھلا ہوا ہاہایں ہیئت تشریف لائے ہیں ہمولانا سندھی سے خاکسار کو بھی تعارف حاصل تھا اور دیوبند میں رہ کر دل ودماغ پر ان کی عظمتوں کے نقوش مرتسم ہو چکے تھے، مولانا تشریف لائے تو پوری مجلس نے تعظیماً کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا اور اب مجلس کا صدر نشین سندھ کے ریگستانی علاقہ کا ایک انقلابی دل ودماغ کا مالک انسان تھا، یاد پڑتا ہے کہ مولانا مرحوم کی جیب میں اس وقت سفری کے چند دانے تھے، مولانا مرحوم گفتگو میں مشغولیت کے باوجود جیب میں ہاتھ ڈالتے، سفری کے دانے نکالتے اور منہ میں رکھ لیتے، اور پھر گفتگو میں مشغول ہو جاتے، ایک علمی موضوع پر برجستہ فاضلانہ تقریر، ولی اللہی فلسفہ کا فلسفیانہ اندازِ بیان۔ مولانا قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر۔ حضرت سیدنا شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کا تذکرہ، تمام مجلس ہمہ تن گوش، مرحوم کے سامنے حاضرین پورے ادب واحترام کے ساتھ گردن جھکائے بیٹھے ہیں، پوری توجہ کے ساتھ ہر شخص ان کی بات سننا چاہتا ہے کہ عین اسی وقت جب مولانا کے لب ولہجہ میں تندی وتیزی بڑھتی ہے تو اسی کے ساتھ مولانا مرحوم کی وہ حرکت بھی یعنی سفری کو جیب سے نکال لینا اور کھا لینا مسلسل ہونے لگتی ہے، مولانا مرحوم کی یہ ادا کم از کم میرے لئے تو حیران کن تھی۔ کیا عرض کروں اس وقت تو اپنی نادانی کی وجہ سے ان کی اس حرکت کو دیوانگی وجنون پر محمول کر رہا تھا اس سراپا انقلاب کے لئے یہ جملے قلم سے نکلتے ہیں تو بے اختیار اقبال مرحوم کا شعر یاد آجاتا ہے کہ ؎

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک۔ یا دامن یزداں چاک

اس کے بعد مولانا سندھی مرحوم جب کبھی دہلی میں ہوتے تو فقیر اکثر ان کو ادارہ

شرقیہ میں تشریف لاتے ہوئے دیکھتا، مرحوم اپنی مجلسوں میں امام ولی اللہ الدہلوی رحمتہ اللہ اور حضرت شیخ الہند برد اللہ مضجعہ کا ذکر جس ذوق وشوق سے فرماتے اس سے مخاطب کے ذہن میں ان لوگوں کی عظمت اور عقیدت لازمی طور پر پیدا ہوتی اور پھر مجھ ایسے دیوانہ کے دل ودماغ کا ایسی باتوں سے متاثر ہونا ضروری تھا۔

مرحوم کی تقریریں اور ان کی مجلس کی حاضری اپنا کام کر کے رہی، اور ایک دن صبح سویرے ایک دیوانہ دریافت کرتے کرتے اس گورستان تک جا پہنچا کہ جہاں ہندوستان کے علم وفضل، زہد وتقویٰ کے درخشاں ستارے آرام کی نیند سو رہے ہیں مری مراد شاہ ولی اللہ اور ان کے خاندان کے افراد کے مزار ہائے پُر انوار سے ہے، یہاں پر پہنچکر دیکھتا کیا ہوں کہ بے اختیار زبان سے کچھ ایسے کلمات نکل رہے ہیں جن کا مفہوم ومنشا یہی تھا کہ "اے خدائے دوجہاں مالک زمین وآسمان بس اب اپنے اس عاجز بندہ کو بھی توفیق دے کہ وہ بھی اپنی خاندانی وراثت سنبھالنے کی طرف متوجہ ہو اور کم از کم پچیس سال سے گُل ہوئی روشنی ایک بار بہا نخانۂ قلب کو پھر روشن کر دے" کچھ ایسے ہی الفاظ تھے جو دل سے اُٹھ رہے تھے اور زبان کی راہ سے نکلکر فضا میں گم ہو جاتے،

اس پہلی حاضری کے بعد اب اس ظلوم وجہول کی امام دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پُر انوار سے ایسی وابستگی ہوئی کہ گاہ بگاہ حاضری کے بجائے عقیدت وارادت کشاں کشاں روزانہ مزار مبارک کے سامنے لے جاکر کھڑا کر دیتی اور وہاں پہنچنے پر وہی چند تمنّائیں دعا کے لب ولہجہ میں بے ساختہ زبان پر جاری ہوتیں۔

اس کے ساتھ ہی توفیق الٰہی کی ایک اور کرشمہ کاری قابل بیان ہے وہ یہ کہ

انہیں ایام میں اقبال مرحوم کی "بانگ درا" کا ایک خاص مقصد کے تحت مطالعہ جاری تھا دوران مطالعہ میں نظر کے سامنے سے "التجائے مسافر بہ درگاہِ حضرت محبوب الٰہی دہلوی" گذری، پوری التجا کو ایک دو مرتبہ نہیں بلکہ بار بار پڑھا، غور کیا تو نظر آیا کہ اقبال نے جو کچھ التجا کی تھی آنے والے حالات نے التجا کے ایک، ایک جزء کو پورا کیا ہ۔

اقبال مرحوم کی التجا واقعی میری محسن ہے کہ انھیں چند اشعار کی تاثیری قوتوں نے مجھکو سلطان الاولیا، حضرت محبوب الٰہی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ معلی تک پہنچادیا۔

اب کیا عرض کروں کہ کن تمناؤں اور دلولوں کو لیکر وہاں حاضر ہوتا اور پہروں مزارِ مبارک کے سامنے کن خیالات میں گم کھڑا رہتا، میں نہیں کہہ سکتا کہ یورپ کے آئے ہوئے خیالات سے متاثر دل ودماغ اور نئی روشنی کے دل دادہ طبقے میرے ان الفاظ کو پڑھکر کہاں تک مجھکو مطعون کریں گے اور کیا کچھ نہ کہیں گے، لیکن جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا اور میرے تجربہ میں جو چیزیں آئیں ان کو باطل، غلط، مبنی بر اوہام سمجھنے کے لیئے ہرگز تیار نہیں، میری آنکھیں جو کچھ دیکھ چکیں اور میرے دل ودماغ نے جو محسوس کیا اس کو کیسے باطل قرار دے سکتا ہوں، ؟

مختصر یہ کہ آج علوم دینیہ سے فراغت، دارالعلوم دیوبند سے وابستگی، انھیں دو مزار پرانوار پر حاضری کا نتیجہ تصور کرتا ہوں خواہ اس کو ہفوات پر محمول کیا جائے یا جاہلانہ عقیدت کا غلط نتیجہ سمجھا جائے لیکن میں خود حالات کے نشیب وفراز پر نظر کرتا ہوں تو مجھکو اس کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ؂

اگر سیاہ دلم داغ لالہ زارِ تو ام
دگر کشادہ جبینم گلِ بہارِ تو ام

فقیر اپنی جگہ پر علوم دینیہ کی طرف اچانک توجہ کا دوسرا اور حقیقی سبب اس ہی کو قرار دیتا ہے اور لطیف کریم کے لطف خفی کی راہ بظاہر یہی معلوم ہوتی ہے، بہر حال دہی میچ میرزحمن کا مقصد مشرقی امتحانات سے کیا تھا؟ چند صفحات پہلے مذکور ہوا وہ اپنے آپ کو "ازہر الہند دار العلوم دیوبند" کے دروازہ پر کھڑا پا رہا تھا ؎

آخر گل اپنی صرف درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بہر حال قلب میں اس داعیہ کے پیدا ہونے کے ساتھ کہ عربی پڑھنی چاہیے کسی اچھے اور مناسب استاد کی تلاش ہوئی، والد مرحوم مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ علیہ کے تلامذہ کی ایک بڑی جماعت اس وقت دار العلوم میں موجود تھی اس تعلق کی وجہ سے ہر شخص مجھکو پڑھانے پر تیار تھا اور میں خود بھی ہر ایک سے پڑھ سکتا تھا۔ ؏

من چمن میں چاہے جہاں رہوں مرا حق ہی فصل بہار پر

لیکن اس موقع پر سابقہ تجربہ نے راہ نمائی کی اور ارادہ کی پوری قوت کے ساتھ اپنے سابق استاد محترم مولانا قاری اصغر علی صاحب سے پڑھنے کا فیصلہ کیا گیا، استاد موصوف میرے بڑے محسن، کرم فرما شفیق مربی ہیں اور ان کی عنایت و شفقت شروع سے آج تک میرے شامل حال رہی، اس لیے چند سطور میں ان کا مختصر سا ذکر کرنا چاہتا ہوں، قاری صاحب کا ذکر اس لیے بھی ضروری ہے کہ ان کے تمام احسانات کے ساتھ ایک بڑا کرم یہ بھی ہے کہ حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب مدظلہ العالی کی بارگاہ میں میری رسائی کا باعث انہی کی ذات گرامی تھی۔ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان

استاذ محترم مولانا قاری اصغر علی صاحب

قاری صاحب سہنپور ضلع بجنور کے باشندے ہیں، ابتدائی تعلیم مدرسہ شاہی مرادآباد میں حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم دیوبند تشریف لائے اور سندِ فراغت یہیں سے حاصل کی، حضرت العلامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص تلامذہ میں سے ہیں، یوں تو قاری صاحب کو علوم پر عبور حاصل ہے اور درس نظامی سے متعلق ہر چھوٹی بڑی کتاب کا درس دے سکتے ہیں اور دارالعلوم دیوبند میں متوسط درجہ کی کتابیں پڑھا بھی چکے ہیں لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ خرد سال بچوں کو ابتدائی کتابیں اس انداز سے پڑھاتے ہیں کہ بچے بڑی دلچسپی اور شوق کے ساتھ ان کے درس میں شریک ہوتے ہیں، مختصر سی تقریر، سلجھے ہوئے پیرایہ میں، دل نشین لب ولہجہ کے ساتھ اس طرح کرتے چلے جائیں گے کہ مبتدی طالب علم اپنے دل ودماغ میں ان کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو اترتا ہوا پائیگا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ طالب علم ان کی درسگاہ سے اٹھتا ہے تو درس کی تمام تقریر اس کو محفوظ ہوتی ہے، ان کے یہاں کی سنی ہوئی باتیں اس بلید الذہن کو آج تک یاد ہیں، طبیعت میں ایک خاص ذکاوت اور جودت ہے، ان کی طباعی اور خداداد ذہانت وفطانت کو دیکھکر یقین ہوتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں ایک بڑی شخصیت کے مالک اور متعارف علماء میں سے ہوتے لیکن ایک عرصہ سے مہلک امراض اور مزمنہ بیماریوں میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ان کی علمی ترقیاں کچھ رک سی گئیں۔

قاری صاحب کے طرۂ امتیاز وافتخار میں یہ چیز اور اضافہ کرتی ہے کہ وہ حضرت

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی دامت برکاتہم کے خادم خاص اور بڑے معتمد علیہ ہیں، ان کی ہر دلعزیزی، گراں قیمتی کا ایک خاص سبب یہ بھی ہے۔ ؎

داغ غلامیت کرد۔ رتبۂ خسرو بلند
میر ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

اور واقعی یہ قاری صاحب کی خوش قسمتی، پیروزہ بختی ہے کہ ان کو حضرت شیخ کی خدمت کی سعادت حاصل ہے، خود ہمارے قاری صاحب بھی اکثر فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نے اپنے ایک مخصوص بندہ کی خدمت کا موقع عنایت فرما کر مجھ پر بڑا احسان اور کرم کیا ہے۔ ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اس عاجز کی ابتدائی تعلیم تمام کی تمام قاری صاحب کے زیر احسان ہے غالباً دو سال کے قلیل عرصہ میں انھوں نے مجھکو شرح ملا جامی تک پہنچا دیا تھا، یہ ان کے طرز تعلیم کی پیدا کردہ دلچسپی تھی کہ آج یہ ظلوم و جہول "زلف عربی" کا دل دادہ ہے، سچی بات یہ ہے کہ ان کے کرم اور توجہ کا نتیجہ ہے کہ علوم دینیہ سے برائے نام فراغت حاصل ہوئی۔ خداوند تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

اس کے بعد میں اپنے محبوب استاذ حضرت شیخ الادب مدظلہ تعالیٰ کا ذکر شروع کرتا ہوں کہ ان چند صفحات کی تسوید کا باعث انھیں کے حالات زندگی کا بیان ہے۔ وما توفیقی الا باللہ

اعزاز العلماء استاذ الاساتذہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب

ہرگز نیاید از نظر صورت ز رویت خوب تر
بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

بوڑھے لیکن نہایت جواں ہمت، ضعیف العمر مگر کافور پیری میں جوانی کی آگ پنہاں، ادب کے شیخ لیکن لاثانی فقیہ مگر بے نظیر، فضل و کمال کے بحر بے پایاں، زہد و تقوی کے پہاڑ، فضل و کمال - اور کمالِ فضل کے روشن منارہ جن کو دیکھکر اسلاف کی یاد تازہ ہو - اکابر کے نقش قدم پر چلنے والے، علما ر وعلم کے معیار پر پورے پورے اترنے والے، ہندوستان کی واحد مرکزی یونیورسٹی (دار العلوم دیوبند) کے شیخ الحدیث، استاذ الاساتذہ شیخ الشیوخ (خداوند تعالیٰ ان کو دیر تک زندہ وسلامت رکھے) مولانا محمد اعزاز علی صاحب کا نسب نامہ یہ ہے -

نسب -

حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب بن محمد مزاج علی صاحب بن حسن علی صاحب بن خیر اللہ صاحب الخ

آبائی وطن -

مراد آباد کے مضافات میں ایک مشہور قصبہ "امروہہ" آبائی وطن ہے قبیلہ کا نام کمبوہ[1] ہے

---

[1] قبیلہ کمبوہ کے تین مشہور سلسلے ہیں - ان تین سلسلوں میں سے ایک بت پرست ہے اس کے بعض افراد ... (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

جو ہندوستان کا ایک مشہور قبیلہ ہے آبا و اجداد شاہی لشکر میں بلند مناصب اور اونچے عہدوں پر فائز تھے۔

پیدائش

ہندوستان کے مشہور و مردم خیز شہر بدایوں، جو ہندوستان کے ہزارہا صوفیا و اولیاء کا مدفن اور حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کا وطن ہے اسی شہر میں ۱۳۰۰ھ میں غروب شمس کے وقت استاذ محترم منشی محمد مزاج علی کے یہاں پیدا ہوئے، نانا جان نے "اعزاز علی" نام تجویز کیا۔

تعلیم

حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ میرے والد مرحوم کو تعلیم سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی اور کثیر المشاغل ہونے کی وجہ سے وہ ہماری تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ بھی نہیں ہو سکتے تھے لیکن اس کے ساتھ تعلیمی ضروریات کی کفالت کرتے اور اس سلسلہ میں جس قدر مصارف ہوتے ان کو خندہ پیشانی سے ادا کرتے، لیکن میری والدہ کو تعلیم سے بے حد شغف تھا اور ایک دیندار خاندان کی نور چشم ہونے کی وجہ سے دینی ذوق ان میں کافی موجود تھا۔ اس

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ ۲۷ کا) سہارنپور اور اس کے قرب و جوار میں موجود ہیں۔ دوسرا سلسلہ جسکو غالباً حلقہ بگوش اسلام ہوئے دو سو سال گذرتے ہیں انبالہ علاقہ پنجاب میں یہ لوگ آباد تھے، لیکن اب تقسیم پنجاب کی وجہ سے یہ لوگ ہند و پاکستان کے مختلف حصوں میں پھیل گئے ہیں۔ تیسرا مشہور سلسلہ جس سے استاذ محترم کا تعلق ہے میرٹھ مرادآباد، بریلی وغیرہ میں آباد ہے بعض مصنفین نے کیونکہ اس مقام پر تاریخی غلطی کی ہے اور تینوں شاخوں و سلسلوں کو ایک ہی بنا یا ہے اسلئے یہ تحقیق پیش کی گئی۔ انظر

دینی ذوق کی وجہ سے انھوں نے مولانا کے بڑے بھائی کو بڑی محبت اور شوق واشتیاق کے ساتھ کلام پاک حفظ کرایا تھا۔ اور اس کے بعد چاہتی تھیں کہ ان کی تعلیم جاری رہے لیکن اردو کے چند درجوں کے علاوہ ان کا تعلیمی سلسلہ خود ان کی بدشوقی کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا۔

مرحومہ استاذ محترم کے بڑے بھائی سے جب اس طرح مایوس ہوگئیں تو انھوں نے اپنی تمام توجہات مولانا ممدوح کی جانب مرکوز کردیں اور صبح وشام انکو یہ فکر تھا کہ "اعزاز علی" کسی طرح قرآن کریم حفظ کرلے۔

شاہجہاں پور واپسی

مولانا محترم کی عمر ابھی بہت تھوڑی تھی کہ والد صاحب کا بسلسلہ ملازمت شاہجہانپور تبادلہ ہوا اور والد صاحب کے ہمراہ مولانا بھی شاہجہاں پور پہنچ گئے، وہ جس وقت شاہجہاں پور آئے تو عمر اسوقت اتنی ہوچکی تھی کہ ان کو کسی مکتب میں قرآن شریف کی ابتدائی تعلیم کے لئے داخل کردیا جائے۔

قرآن شریف کی ابتدائی تعلیم

لہذا ایک کابلی الاصل "قطب الدین" نامی شخص کے سپرد کئے گئے، ان صاحب کے پاس مولانا نے قرآن شریف کے دو ثلث ناظرہ پڑھے، اس کے بعد مولانا کو ایک جیّد حافظ (جن کا نام حافظ شرف الدین تھا) کے سپرد کیا گیا، مولانا نے انھیں حافظ صاحب مرحوم کی نگرانی میں تمام کلام اللہ حفظ کیا۔ اور الحمد للہ کہ اب حضرت مولانا کا شمار قرآن شریف کے جیّد حفاظ میں ہے اور باوجود کبر سنی وانحطاط قویٰ کے رمضان المبارک کے ماہ سعید میں مولانا کا محبوب مشغلہ۔ دن کو حفاظ کا قرآن سننا

اور شب کو تراویح میں خود سنانا ہے، اب سے کچھ سال قبل وہ رمضان المبارک میں
تین، چار بار قرآن کا ختم تراویح میں کر لیتے تھے، اور اب بھی کہ مولانا کی صحت
و قویٰ جواب دے چکے ہیں لیکن ان کے اس محبوب مشغلہ میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں
آیا، اور یہی حفظ قرآن مولانا کی عربی تعلیم کا پیش خیمہ اور محرک ثابت ہوا
تفصیل اس کی آئندہ آتی ہے۔

اردو۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم۔

قرآن مجید کے حفظ کر لینے کے بعد مولانا کو اردو تعلیم میں لگا یا گیا۔ مولانا
فرماتے تھے "مجھکو یہ یاد نہیں کہ میں نے اردو کی تعلیم کس سے حاصل کی، غالب خیال
یہی ہے کہ فارسی کے چند رسالہ پڑھنے کے بعد اردو پڑھنے لکھنے کی صلاحیت
و استعداد خود ہی پیدا ہو گئی تھی"۔

بہر حال انھوں نے فارسی کی تعلیم اپنے والد مرحوم سے حاصل کی، مولانا کے
والد اگرچہ ملازمت پیشہ آدمی تھے اور سرکاری دفاتر میں امور متعلقہ کو انجام دیتے
تھے لیکن ان کی فارسی بے حد پختہ اور مضبوط تھی، اس کے ساتھ
ان کے فارسی پڑھانے کا طریقہ بھی کامیاب تھا۔ مولانا نے اپنے والد مرحوم سے فارسی
میں۔ کریما۔ محمود نامہ۔ مامقیماں وغیرہ فارسی کی کتابیں پڑھیں، یہ کتابیں اور فارسی
کے ابتدائی اسباق، والد صاحب سے اس طرح پڑھے گئے کہ رات کو وہ اپنے
رجسٹر۔ سرکاری کاغذات وغیرہ کھولکر کام کرنے بیٹھ جاتے، اور مولانا ان کے قریب
سامنے کھڑے ہوئے پڑھتے رہتے، ایک ہی وقت میں ان دونوں کاموں کو جس خوبی
سے انجام دیا جاتا وہ مولانا کے والد صاحب کا کمال ہے کہ ایک جانب اہم سرکاری

دستاویزات کا تصفیہ اور دوسری طرف کامل مشغولیت وانہماک کے ساتھ مولانا کو درس دیا جاتا، اور وقت واحد میں ان دو مشغولیتوں سے وہ کبھی نہ گھبراتے۔

غرضیکہ فارسی تعلیم بڑی کڑی نگرانی کے ساتھ والد صاحب مرحوم کے پاس ہوئی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام دارالعلوم میں۔ مولانا محترم فارسی میں بھی استاذ کل سمجھے جاتے ہیں[1]

حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ اس وقت گھر میں ایک اچھا علمی ماحول بن گیا تھا، ہم نے اپنی استعداد و صلاحیت کے مطابق جو مختلف دلچسپ مشاغل اختیار کر رکھے تھے ان میں سب سے زیادہ ہمارا محبوب مشغلہ "بیت بازی" تھا، ہم اس بیت بازی میں شرط کرتے کہ حریف کے پیش کردہ شعر کے آخری حرف، مقابل کے پیش کردہ شعر کا پہلا جز ہوگا، دوسری شرط یہ تھی کہ اگر ایک بار مجلس میں شعر استعمال ہو چکا تو پھر اس شعر کو دوبارہ استعمال کرنے کا کوئی مجاز نہ ہوگا! اور اس پر بھی اگر کوئی استعمال کرتا تو "الغلط" کہکر خاموش کر دیا جاتا۔ اور آخر میں اس بیت بازی میں ایک اور شرط کا اضافہ کر کے بے حد مفید بنانے کی کوشش کی گئی، شرط یہ تھی کہ شعر کا پیش کرنے والا۔ اس کا مطلب بھی بیان کرے اور اگر وہ مطلب بتا نہ سکا تو وہ شعر ساقط الاعتبار ہوگا۔ یہ مجلس نشاط

---

[1] مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی نے جو مولانا ممدوح کے تلمیذ بھی ہیں رسالہ "برہان" دہلی میں اپنے ایک مقالہ میں فارسی کے ایک شعر کا مطلب ایسا متعین کیا جو شاعر کے منشا کے خلاف تھا۔ حضرت الاستاذ نے مولانا اکبر آبادی کو اس پر متوجہ کیا، یاد پڑتا ہے کہ مولانا اکبر آبادی نے علامہ سید سلیمان صاحب ندوی سے بھی تحقیق طلب کی تھی تو علامہ ندوی نے بھی حضرت مولانا کی تصویب تائید فرمائی تھی۔ یہ مولانا کی فارسی دانی کی کامل شہادت ہے۔ انظر

ومقابلہ روزہوتی اور خاندان کے بچوں کے علاوہ محلہ کے بچے بھی اس میں دلچسپی کے ساتھ حصہ لیتے، استاد فرماتے تھے کہ اس بیت بازی سے ہزارہا شعر یاد ہونے کے علاوہ ہم کو شعروشاعری سے اچھی خاصی مناسبت اسی وقت ہوگئی تھی

مولود خوانی

مولانا ممدوح ابھی اپنے والد سے فارسی کی تعلیم حاصل کررہے تھے کہ اس وقت شاہجہاں پور میں مولود خوانی کا عام چرچا تھا، اور مولود کرانے کا شوق وہاں کے جاہل طبقہ میں اس قدر عام ہوگیا تھا کہ ہر قسم کی مجلسوں کا ایک ضروری جزء یہ مولود تھا، خواہ عیش ونشاط کی مجلس ہو یا مجلس غم و ماتم۔ بہرحال ہر مجلس میں مولود کا ہونا ضروری تھا۔

ادھر استاذ محترم کا طفولیت کا عالم، شعروشاعری کا شوق، شاہجہانپور کا قیام۔ مولانا کو اور مولانا کے دوسرے بھائی جن کا نام "محمد اقبال" تھا مولود کی مجالس میں لے کر پہنچنے لگا، اور چند روز کے بعد مولٰنا اور ان کے بھائی مولود کے پڑھنے میں ایسے مشہور ہوگئے تھے کہ شاہ جہاں پور کی کوئی مجلس مولود ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہ دونوں بھائی شریک نہ کئے جاتے اور مولانا نے ایک زمانہ تک بڑے ذوق وشوق کے ساتھ ان مجلسوں میں شرکت کی۔

لیکن جب ہوش وآگہی نے دامن سنبھالا تو اس قسم کی مجالس میں شرکت خود بخود ناگوار اور گراں گذرنے لگی، چنانچہ جلد ہی ان مجلسوں کی شرکت

سے دامن کھینچ لیا گیا۔[۱] لیکن بیت بازی کی طرح مولود خوانی اور مجالس مولود کی شرکت بھی استاذ محترم کے شاعرانہ ذوق کے لئے مہمیز کا کام کرتے رہی۔

بہر حال شاہجہان پور میں حضرت مولانا کی فارسی تعلیم کی تکمیل ہو چکی تھی اور ایک خاص

---

۱ حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ مجھ پر اس زمانہ میں مجالس مولود میں کثرت سے شرکت اور زیادہ سے زیادہ اس سے اشتغال رکھنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان دنوں میں اگر کبھی میں کچھ کہتا بھی تھا تو جو کچھ کہتا وہ مولود خوانی کے عام لب و لہجہ میں ہوتا، فرماتے کہ ان دنوں میں ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ ہم شاہجہانپور کا قیام ترک کر کے قصبہ تلہر میں آ رہے تو وہاں جو مکان عارضی طور پر رہائش کے لئے لیا گیا وہ بہت مختصر سا تھا۔ سامنے ایک معمولی قسم کا چھپر پڑا ہوا تھا اور وہ اس قدر نیچے کو جھکا ہوا تھا کہ اگر اندر داخل ہونے میں ذرا سی بد احتیاطی اور چوک ہو جاتی تو یقیناً سر میں چوٹ لگتی، ایک روز میرے چھوٹے بھائی نے ایک شعر لکھ کر چھپر کے سامنے آویزاں کر دیا، شعر تھا۔ ؎

گردن کشی ملاتی ہے انسان کو خاک میں

لازم ہے آدمی کو ذرا سر جھکا۔ چلے

میں اس وقت مدرسہ پڑھنے کے لئے گیا ہوا تھا، واپس ہوا تو یہ شعر آویزاں پایا، برجستہ مجالس مولود کے لب و لہجہ میں دو شعر کہہ کر اس کے ساتھ لکھ دئے گئے ؎

جب سے ہم آئے ہیں تلہر۔ صلّ علیٰ محمّد

ٹوٹا سا اک ملا ہے گھر صلّ علیٰ محمّد

جس میں پڑے ہیں دو چھپر صلّ علیٰ محمّد

جس سے ٹوٹتے ہیں سر صلّ علیٰ محمّد

اس واقعہ اور ان اشعار کو پڑھتے وقت یہ پیش نظر رہے کہ حضرت مولانا کی عمر اس وقت دس[۱۰] گیارہ[۱۱] سال سے زائد نہ ہوگی انظر

واقعہ کے پیش آنے پر جس کی تفصیل ابھی پیش کی جاتی ہے ۔ حضرت مولانا کے قلب میں عربی تعلیم کے شروع کرنے کی خواہش پیدا ہونے لگی تھی، اور مولانا ممدوح اپنی اس آرزو و تمنا کی تکمیل کی راہیں تلاش کر رہے تھے کہ اسی دوران میں مولانا کے والد صاحب کا تبادلہ تلہر ضلع شاہجہانپور کا ہوا اور تمام گھر والوں کے ساتھ مولانا کو شاہجہانپور سے تلہر منتقل ہونا پڑا۔

تلہر کا قیام اور عربی کی ابتدائی تعلیم

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرت مولانا کی عربی تعلیم میں مشغولیت کا باعث قرآن کریم ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ مولانا ممدوح نے حفظ کر لینے کے بعد پہلی بار قرآن کریم تراویح میں سنایا تو اس وقت وہ بہت خرد سال تھے۔ سخت جد وجہد اور بڑی مشقت اٹھانے کے بعد قرآن شریف ختم ہوا تو تمام خاندان والوں کو اس موقع پر بے حد مسرت ہوئی خصوصًا ان کی والدہ مرحومہ جنھوں نے خاص اپنے شغف اور شوق واشتیاق سے مولانا کو حفظ کرایا تھا اس موقع پر بہت مسرور تھیں۔

خرد سالگی اور کم عمری ہی میں ختم کلام پر مولانا کی بے حد ہمت افزائی کی گئی ۔ صبح ہوئی تو مولانا اس امید پر مکتب میں پہنچے کہ آج حافظ صاحب اور مکتب کے ساتھی بھی تعریف کرنے میں دریغ نہ کریں گے، لیکن وہ مکتب میں پہنچے تو ان کے استاد قرآن یعنی حافظ صاحب نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ "اس حفظ قرآن کا کوئی فائدہ نہیں، جب تک حافظ اس کے معنی سے واقف نہ ہو۔ اور معانی قرآن کا سمجھنا عربی پڑھنے ہی پر موقوف ہے [1]

---

[1] یہ بھی کچھ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا کے علم ظاہر کا سبب جس طرح قرآن پاک ہے اسی طرح اُن کے عقیدہ کی طہارت و نظافت کا سبب بھی قرآن شریف ہی ہے، واقعہ یہ پیش آیا کہ شاہجہانپور میں مولانا کے رہائشی مکان کے قریب ایک آریہ عطار کی دوکان تھی (باقی حاشیہ اگلے صفحہ ۳۵ پر)

حافظ صاحب کی کرامت کہیئے یا خدائی قدرت کا کرشمہ کہ مولانا نے حافظ صاحب سے اتنی بات سنتے ہی اسی وقت عربی پڑھنے کا عزم کر لیا اور اس کے بعد اس عزم و ارادہ کی تکمیل کیسے ہوئی؟ اسی کی تفصیل پیش کرنا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ مولانا کی فارسی تعلیم کی تکمیل شاہجہانپور ہو چکی تھی۔ اور اس کے بعد حضرت مولانا کو اپنے والد کے ہمراہ شاہجہانپور سے تلہر آنا پڑا تھا کیونکہ مولانا عربی پڑھنے کا عزم و ارادہ کر چکے تھے، اس لئے تلہر میں پہنچنے کے بعد، وہاں کے مشہور مدرسہ عربی "گلشن فیض" میں مولانا مقصود علی خاں صاحب مرحوم صدر مدرس مدرسہ کے پاس عربی تعلیم کی ابتدا کی گئی۔

مولانا مقصود علی خاں ایک کہنہ مشق اور منجھے ہوئے استاد تھے اور اس کے ساتھ بچوں کو ایک مخصوص دلچسپ انداز میں تعلیم دینے کا طریقہ جانتے تھے، اس لئے حضرت مولانا نے بہت جلد کچھ تو اپنے شوق و ذوق اور کچھ مولانا مقصود علی خاں کی پیدا کردہ دلچسپی سے درس نظامی کی ابتدائی کتابیں بڑی محنت سے پڑھ ڈالیں تا آں کہ

(باقی حاشیہ گذشتہ صفحہ ۳۴ کا) اس کی عمر غالباً ساٹھ برس سے کم نہ ہوگی، حضرت مولانا کا ہے بگاہے اس کی دوکان پر پہنچتے تو تھوڑے سے وقت بحکم بیدہ نظام اسلام اور سیرت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر بہت سے اعتراض کر دیتا۔ کم عمری کی وجہ سے مولانا کے عقائد کی بنیادیں متزلزل ہونے لگیں، کہ خوش قسمتی اسی زمانہ میں حضرت مولانا کو دار العلوم دیوبند لے آئی اور سیدنا حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہٗ کے درس بیضاوی میں پہلے ہی دن دل کے تمام خدشات اور شکوک و ریب کے تمام کانٹے نکل گئے۔ انظر

ایک قلیل مدت میں مولانا کی تعلیم "شرح ملا جامی" تک پہنچ چکی تھی۔

تلہر کا ترک قیام اور مولانا کی تعلیم میں طویل خلاء

مولانا ممدوح تلہر میں عربی کی تعلیم حاصل کرنے میں شوق و اشتیاق کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور مولانا مقصود علی خاں صاحب بھی اپنے تلمیذ سعید کی محنت و جد و جہد کو دیکھکر عرق ریزی کے ساتھ پڑھانے میں زیادہ سے زیادہ محنت کر رہے تھے کہ اسی دوران میں مولانا کے والد حکومت کی جانب سے پنشن پاکر شاہجہانپور میں مستقل قیام کے ارادہ سے تلہر سے روانہ ہوگئے۔

تلہر کا یہ ترک قیام خود مولانا اور ان کے شفیق استاذ مولانا مقصود علی خاں پر سخت گراں تھا۔ لیکن والد صاحب کی رائے اور ارادہ کی مجبوری نے مولانا سے تلہر کا قیام ترک کرالیا۔ شاہجہاں پور آنے کے بعد مولانا کی تعلیم ان کے بڑے بھائی محمد واجد علی صاحب کی زیر نگرانی شروع ہوئی۔ واجد علی صاحب اگرچہ برادرانہ شفقت و تعلق کی وجہ سے اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے۔ لیکن سابقہ تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے مولانا کی تعلیم کے تمام تقاضوں کی رعایت نہ کرسکے اور ان کی ناتجربہ کارانہ غفلت و بے پروائی کے نتیجہ میں مولانا کا کامل ایک سال ضائع ہوگیا۔

مدرسہ عین العلم شاہجہانپور میں داخلہ

حضرت مولانا کو اس ایک سال کے ضائع ہوجانے اور تعلیمی سلسلہ میں اس زمانہ فترت کے واقع ہوجانے کا سخت افسوس اور رنج و ملال تھا، اور اس کی تلافی کے لئے مولانا نے اپنی ذاتی جد و جہد سے کام لے کر اپنا داخلہ شاہجہانپور کی مشہور دینی درسگاہ "عین العلم" میں کرایا یہ عربی مدرسہ مولانا عبدالحق صاحب قدس سرہ کا قائم کیا ہوا تھا۔

اور اس وقت اس درسگاہ میں مولانا قاری بشیر احمد صاحب مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ مفتی اعظم حضرت العلامہ مولانا کفایت اللہ صاحب برد اللہ مضجعہ بھی مدرس تھے۔

حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ میں مولانا قاری بشیر احمد صاحب سے درس نظامی کی اکثر کتابوں کے علاوہ، ملا جامی اور کنز الدقائق بھی پڑھی۔

مولانا بشیر احمد صاحب کی طلباء کے ساتھ بے مثال شفقت۔

حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ مولانا بشیر احمد صاحب طلباء پر غیر معمولی شفقت و عنایت فرماتے، اور ان کی اس ملاطفت و ملائمت سے طلباء کچھ اس درجہ ان سے بے تکلف ہو گئے تھے کہ تکرار کر رہے ہیں درمیان میں اشکالات و شبہات پیش آتے طلباء اٹھتے اور سیدھے مولانا کی آرام گاہ پر پہنچتے، دیکھتے کہ مولانا بے خبر پڑے سو رہے ہیں، لیکن طالب علم بلا تامل ان کو سوتے ہوئے اٹھا دیتے، اور اشکالات کا ان سے حل کراتے، مولانا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیتے، اور طالب علم جب دریافت کر کے فارغ ہو جاتے، تو مولانا پھر سو جاتے۔

حضرت الاستاذ فرماتے تھے کہ ہم اکثر اسی طرح مولانا کو سوتے ہوئے اٹھاتے تھے لیکن مولانا نے ایک روز بھی ہماری اس جسارت پر نہ ہم کو مطعون کیا اور نہ کبھی ناگواری کا اظہار فرمایا۔ اللّٰھم اغفر لہ مغفرۃ واسعۃ

عین العلم ہی میں مولانا نے، حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ سے فارسی کی بعض کتب کے علاوہ فقہ کی مشہور کتاب "شرح وقایہ" پڑھی، مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ کتاب مولانا کو خارج از اوقات مدرسہ کے وقت آرام کو چھوڑ کر پڑھائی، اس کے علاوہ مفتی صاحب مولانا کے ساتھ بڑی شفقت و عنایت کا معاملہ کرتے، اور مولانا بھی مفتی

صاحب کی بزرگانہ شفقتوں کی وجہ سے اپنی ضرورت مفتی صاحب کے سامنے رکھتے اور مفتی صاحب ان کو پورا فرماتے "عین العلم" کی زمانۂ طالب علمی کا یہ تعلق اب تک اسی تابانی کے ساتھ باقی ہے۔

خاکسار نے حضرت مولانا کو مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی موت پر جس قدر متأسف اور متاثر پایا اتنا کسی اور موقع پر مولانا غمگین و مغموم نظر نہیں آئے۔

دارالعلوم دیوبند میں

ؔ عین العلم میں درسی نظامی کی جب متوسط درجہ کی کتابوں سے مولانا فارغ ہوئے

ؔ عین العلم میں قیام کے زمانہ کا مولانا ایک دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک ایسا وقت آیا کہ مدرسہ کے ارباب انتظام نے گرمی کے زمانہ میں مدرسہ کا وقت دوم، دو بجے سے پانچ بجے تک کر دیا۔ شدید گرمی اور مسموم لو کے ہوتے ہوئے طلباء پر مدرسہ میں معینہ وقت میں پہنچنا سخت دشوار ہوا۔ مولانا نے اس موقع پر "واسوخت" کے لب ولہجہ میں کچھ اشعار کہے۔ پہلا شعر تھا۔ ؎

دو بجے کا وقت ہے اور سب پڑے سوتے ہیں اب

اور مجبوراً ہم کو نکلنا ہائے، ہائے

مولانا نے یہ واسوخت اپنی درسی کتاب کے صفحہ پر لکھ دیا تھا، سبق شروع ہوا تو مولانا بشیر احمد صاحب نے مولانا ہی کی کتاب پڑھانے کے لئے لے لی، کتاب کھولی گئی تو پہلے ہی صفحہ پر یہ اشعار نظر آئے، حضرت مفتی صاحب کو بھی سنائے گئے، کیونکہ اس میں کسی کی ہجو یا توہین نہیں کی گئی تھی، اس لئے کسی تادیبی کا۔ وائی کے بجائے چند قہقہے داد کے طور پر ہر طرف سے مولانا کو

تو مولانا بشیر احمد صاحب اور مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اصرار پر مولانا کے قلب میں ہندستان کی مشہور و مرکزی درسگاہ "دار العلوم دیوبند" میں آنے کی خواہش پیدا ہوئی، مولانا اکثر فرماتے ہیں کہ یہ مفتی صاحب کی عنایت و توجہ تھی کہ دیوبند مدرسہ میں مجھکو پہنچا دیا۔ ورنہ خود میرے قلب میں ایسا کوئی داعیہ موجود نہ تھا۔

بہر حال مولانا اپنے دونوں شفیق استاذ کی وجہ سے اور خصوصًا مفتی صاحب کے ایما و اصرار پر دیوبند کا ارادہ کر چکے تھے لیکن ان کی والدہ مولانا کی کم عمری کی وجہ سے اپنے سے جدا کرنے پر اور مولانا کو اس کم سنی کے عالم میں دور دراز جگہ پر جانیکی اجازت دینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتی تھیں عجیب کشمکش تھی، مولانا کا اصرار ہوتا تو ادھر سے ایسی شدت کے ساتھ انکار کیا جاتا۔ مولانا اس صورت حال سے سخت پریشان تھے۔

دیوبند پہنچنے کی پر اسرار تدبیر۔

کہ اسی دوران میں مولانا کے بڑے بھائی کی شادی بریلی میں ہونا قرار پائی۔ اور مولانا اپنے تمام خاندان کے ہمراہ شاہجہانپور سے بارادہ شرکت تقریب بریلی روانہ ہوئے اور بریلی کے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد اپنے ارادہ کی تکمیل اس طرح سے کی گئی کہ اسٹیشن پر اترے تو قریب کے پلیٹ فارم پر دیوبند آنے والی گاڑی تیار کھڑی تھی مولانا انتہائی خاموشی اور رازداری کے ساتھ اٹھے اور دیوبند آنے والی گاڑی میں بیٹھے انجن نے سیٹی دیکر روانگی کا اعلان کیا اور ادھر مولانا کی والدہ کو اس پر اسرار روانگی کا علم ہوا۔ والدہ نے بڑی بے قراری کے ساتھ چلانا شروع کیا اور بار بار بآواز بلند کہتیں کہ

"اعزاز علی! ایک مرتبہ اپنی صورت تو دکھا دو۔"

لیکن تحصیل علم کا سودا اور دوسری جانب یہ خطرہ کہ والدہ پھر ہرگز نہ چھوڑیں گی مولانا کو گاڑی سے اترنے نہ دیتا تھا۔

ٹرین روانہ ہو گئی اور مولانا دیوبند آپہنچے یہاں پہنچنے پر غالباً ایک دو ماہ گزرنے کے بعد والدہ صاحبہ کے انتقال کی خبر آئی۔ حضرت مولانا نے خاکسار کو اکثر بار بار بڑے رنج و غم کے ساتھ فرمایا کہ

"بریلی سے روانہ ہوتے وقت، والدہ کی شفقت بھری آواز آج تک کان میں گونج رہی ہے اور دم آخر والدہ کی آخری ملاقات سے محرومی ایک ایسا حادثہ ہے جس کا داغ سینہ پر ہمیشہ باقی رہے گا۔"

بہر حال یہ تشنۂ علم، سچا طالب، علم کا واقعی متلاشی ہندوستان کی اس مرکزی درسگاہ میں آپہنچا جہاں سے علم کے چشمے پھوٹتے ہیں، اور جہاں فضل و کمال کے دریا بہتے ہیں، اور ایک لطیفۂ غیبی نے ایک بے یار و مددگار طالب علم کو کشاں کشاں اس درسگاہ میں لا کھڑا کیا کہ جس درسگاہ کا ایک دن اس آنے والے طالب علم کو مسند نشین علم و فضل ہونا تھا، کسی کو کیا خبر تھی کہ یہ آنے والا جس کے پاس نہ وسائل و ذرائع کی طاقتیں تھیں اور نہ دار العلوم کے ارباب اختیار تک رسائی کی کوئی سبیل، عام طالب علموں کے ریلے، اور غریب الوطنوں کے ہجوم میں عام طلباء کی طرح داخل ہونے والا، آنے والی کل میں اسی دار العلوم سے شیخ الادب و شیخ الفقہ کا خطاب حاصل کرنے والا ہے اور دار العلوم کے علمی حقوق کی ادائیگی اتنے مکمل طریقہ پر انجام دے گا اپنی طویل خدمات کا بار احسان یہاں کے ذرہ ذرہ پر چھوڑے گا۔

پینتالیس برس کے طویل عرصہ سے دار العلوم کا یہ بوریا نشین عالم باعمل، اپنی طویل اور نہایت وسیع خدمات کے انجام دینے میں اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتا، جس طرح اپنی بعض خصوصیات میں یہ شیخ فرد ہے اسی طرح اس معاملہ میں بھی یکہ و یگانہ ہے۔

بہرحال دیوبند پہنچکر امتحان داخلہ میں کامیابی سے فارغ ہونے کے بعد مولانا حافظ احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سابق مہتمم دار العلوم دیوبند سے "ہدایہ اولین" اور دار العلوم کے مشہور منطقی و فلسفی مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری کے یہاں غالباً منطق کی مشہور کتاب "قطبی" اور اس کے علاوہ دوسرے اساتذہ کے یہاں بعض کتابیں شروع کی گئیں۔

دار العلوم میں آئے ہوئے ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ مولانا نے اپنی ہمشیرہ سے جو اسوقت میرٹھ میں تھیں ملاقات کے خیال سے دیوبند سے میرٹھ کا سفر کیا

میرٹھ "مدرسہ قومی" میں طالب علمی

میرٹھ کا سفر اگرچہ صرف ہمشیرہ کی ملاقات کی غرض سے کیا گیا تھا۔ لیکن مولانا وہاں پہنچے تو تذکرۃ الرشید و الخلیل" اور دوسری مشہور و مفید کتابوں کے مصنف مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مصر ہوئے کہ ایک دو سال میرٹھ مدرسہ میں تعلیم حاصل کرو اور اس کے بعد دورۂ حدیث شریف کی شرکت کے لئے دیوبند چلے جانا۔

مولانا اگرچہ مولانا عاشق الٰہی صاحب کی اس تجویز سے متفق نہ تھے، نہ ان کے اس حکم پر عمل کرنے کے لئے آمادگی کا کوئی جذبہ مولانا کے قلب میں موجود تھا لیکن مولانا میرٹھی سے خصوصی تعلق اور گہرے مراسم کی وجہ سے عارضی طور پر دیوبند کا قیام ترک کر دیا اور میرٹھ میں مشہور درسگاہ "مدرسہ قومی" خیر نگر میں بسلسلہ تعلیم داخلہ کرا لیا

اس مدرسہ میں مولٰنا نے مولانا عاشق الٰہی صاحب سے اصول و عروض کی بعض کتابیں اور مولانا عبدالمومن صاحب دیوبندی سے جو مدرسہ کے اس وقت صدر مدرس تھے، عقائد منقولات، و فلسفہ کی اکثر و بیشتر کتابیں پڑھنے کے علاوہ "صحاح ستہ" میں بخاری شریف کے علاوہ سب کتابیں ختم کیں۔ لہ

پھر دارالعلوم میں

میرٹھ میں اس حد تک تکمیل کر چکنے کے بعد مولانا نے مولانا میرٹھی کے سامنے دیوبند میں دورۂ حدیث شریف میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا اور ان کی اجازت سے دیوبند میں مولانا کی دوبارہ حاضری ہوئی اور یہاں پہنچکر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شرکت کی

لہ میرٹھ میں تعلیم کے علاوہ مولانا نے مولانا عاشق الٰہی صاحب کے مطبع "خیر المطابع" میں تصحیح کا کام بھی کیا۔ مولانا یہ خدمت کسی معاوضہ اور مہاجرت کے بغیر انجام دیتے تھے، خیر المطابع سے شائع شدہ حمائل مترجم و محشیٰ کی تصحیح و طباعت مولانا ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ انظر

سلہ مدرسہ قومی کے جلسہ دستار بندی میں جو نواب اسد اللہ خاں کی صدارت میں ہوا تھا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شرکت فرمائی تھی، مولانا عاشق الٰہی صاحب کے حکم پر مولانا نے اس جلسہ میں اپنا ایک مقالہ پڑھکر سنایا تھا، حضرت شیخ الہند اور تمام حاضرین جلسہ نے اس مقالہ کو بے حد پسند فرمایا، بلکہ بعض پختہ اور کہنہ مشق مضمون نگار جو مضامین پڑھکر سنانے کے ارادہ سے جلسہ میں شریک ہوئے تھے یہ دیکھکر کہ ایک طالب علم کا مقالہ غیر معمولی طور پر پسند کیا گیا ہے اس مصلحت سے کہ اگر ہمارے مضامین پسند نہ کئے گئے تو ایک کم سن اور نو خیز طالب علم کے مقابل میں یہ ذلت آمیز شکست ہے اپنے مضامین پڑھنے سے روک لئے تھے۔ اسی جلسۂ دستار بندی میں مولانا کا حضرت شیخ الہند سے تعارف کرایا گیا، دارالعلوم میں دوبارہ قیام کے زمانہ میں یہ تعارف و تعلق شیخ الہند سے علمی استفادہ کے لئے کافی مدد معاون ثابت ہوا۔ انظر

سعادت حاصل کی گئی۔

مولانا نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے صحیح بخاری شریف، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد کے علاوہ، ہدایہ آخرین، بیضاوی شریف اور توضیح وتلویح پڑھی اس کے علاوہ فنون کی بعض کتابیں، دارالعلوم کے معقولی استاذ مولانا غلام رسول صاحب ہزاروی سے اور فتویٰ نویسی کا کام، قطب العالم حضرت مولانا عزیزالرحمٰن صاحب مرحوم سے سیکھا اور ادب کی اکثر کتابوں کی تعلیم مولانا معزالدین[1] صاحب سے حاصل کی، اس طرح دارالعلوم کے اس دوبارہ قیام میں حضرت مولانا نے حدیث کی بنیادی کتابیں ایک ایسی ہستی سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی کہ جو ایک ہی وقت میں مسند نشین فضل وکمال، علم وفضل کا بحر ناپیدا کنار محدث یگانہ، زاہد شب بیدار، زاہد ومتورع، مدبر، مفکر، حریت پسند، انقلابی انسان اور علوم نبوی کی تدریس کا واقعی مستحق تھا۔[2]

---

[1] مولانا کا اپنے حواشی میں "شیخ الادبا" کے لفظ سے آپ ہی کی ذات گرامی کی جانب اشارہ ہوتا ہے، یہ صاحب باوجود عالم وفاضل ہونے کے دورۂ حدیث شریف میں شرکت کے لئے دور ودراز کا سفر طے کرنے کے بعد دارالعلوم پہنچے تھے، بظاہر حال نہایت شکستہ، پریشان حال وبال، کم آمیز، بڑے بے نیاز، سب سے الگ تھلگ، ادھر ادھر پھرتے رہتے تھے، لیکن ادب کے غوامض اور اس فن کے بنیادی اصول پر جب کبھی بولتے تو ایک ایسا دریا محسوس ہوتا جس کے نہ کنارہ کا علم اور نہ عمق کا پتہ، مولانا نے مولانا معزالدین صاحب سے نفحۃ الیمن کے علاوہ ادب کی تقریباً تمام کتابیں پڑھی ہیں۔ انظر

[2] اس موقع پر ایک واقعہ جو راقم السطور نے حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے سنا ہے (باقی حاشیہ صفحہ پر لکھے ہے)

آج ہندوستان کی بڑھتی ہوئی فرقہ پرستی اور محسن کش سیاسی فضا نے اس بوڑھے

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ ۴۳) لکھنے کو جی چاہتا ہے جس سے حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ کی عظمتوں کا احساس غالباً وہ لوگ بھی کر سکیں گے جن کو اس شیخ اجل کے صحیح مقام سے ابتک ناواقفیت ہے۔

ہندوستان کے مشہور فلسفی و منطقی عالم مولانا عبد الوہاب صاحب جو مولانا عبد الحی صاحب فرنگی محلی کے براہ راست شاگرد اور ریاست حیدرآباد کی حدود میں جن کی درسگاہ منطق و فلسفہ کی کم از کم ہندوستان میں مرکزی درسگاہ تھی، سُنا ہے کہ طلبا ران سے منطق و فلسفہ پڑھنے کے لئے دور دُور سے سفر کر کے پہنچتے۔ خود دار العلوم دیوبند کے مشہور منطقی عالم مولانا رسول صاحب بھاگلپوری نے ان مولانا عبد الوہاب سے پڑھنے کے لئے "بہار" سے حیدرآباد تک کا سفر پیدل طے کیا تھا۔ مولانا وہاب کو منطق و فلسفہ نے اس درجہ پر خود غلط کر رکھا تھا کہ خود کو اپنی زبان سے "مولانا عبد الوہاب" کہتے تھے اور اپنے مقابل میں بڑے سے بڑے عالم و فاضل کو ایک طفل مکتب سے زیادہ نہ سمجھتے تھے یہی مولانا عبد الوہاب صاحب ایک مرتبہ حیدرآباد سے دیوبند تشریف لائے اور دار العلوم کی مشہور عمارت "نودرہ" کے سامنے اپنا سامان رکھوا کر گذرنے والے طلبا سے دریافت کیا کہ "مولوی محمود الحسن کہاں ہیں؟" عقیدت مند طلبا پر یہ انداز گفتگو بڑا گراں گذرا، لیکن کیونکہ ایک نو وارد مہمان کی شکل و صورت میں تھے اس لئے برداشت کیا گیا۔ ع

تم ہی کہو کہ یہ انداز گفتگو کیا ہے

بہرحال جواب دیا گیا کہ "مکان پر تشریف رکھتے ہیں" یہ سُنکر حسب عادت بولے "جاؤ ان سے کہدو کہ "مولانا عبد الوہاب" تشریف لائے ہیں" کسی طالب علم نے حاضر ہو کر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے یہی سب کچھ عرض کر دیا۔ سنکر ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ "ہاں بھائی جاؤ وہ بڑے آدمی ہیں،

(باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر)

انقلابی جرنیل کو بھلا دیا جس نے وطن کی آزادی اور ملک سے غیر ملکی استبداد و اقتدار کو ختم

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ ۴۴ کا) پورے اعزاز و اکرام سے مدرسہ کے مہمان خانے میں ان کو ٹھہرا دیا۔ شام ہوئی تو حضرت والا خود ہی مٹی کے چند برتنوں میں کھانا لے کر تشریف لائے، مولانا عبد الوہاب صاحب چارپائی پر بیٹھ کر کھانا تناول فرماتے رہے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ دیر تک نیچے بیٹھے ہوئے گفتگو فرماتے رہے۔

دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس تمام گفتگو میں حضرت شیخ الہند کا انداز بالکل طالبعلمانہ رہا۔ مولانا وہاب، ہمہ دانی کے زعم میں بہت کچھ کہہ ڈالتے اور ادھر ایک خفیف سی مسکراہٹ اور "جی ہاں"۔ "بے شک" کے سوا اور کچھ نہیں، عشاء کا وقت قریب تھا، مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکان پر تشریف لے گئے اور مولانا وہاب صاحب نے طلباء سے ترمذی شریف کے درس کا وقت دریافت کر کے مہمان خانہ میں آرام کیا، صبح ہوئی تو مولانا وہاب وقت سے پہلے ہی حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی درس گاہ میں موجود تھے۔ حضرت کا درس کے لئے تشریف آوری کا معینہ وقت ہو چکا تھا۔ اور آج خلاف معمول تشریف لانے میں غیر معمولی تاخیر ہو رہی تھی، مولانا وہاب بار بار طلبہ سے دریافت کرتے کہ "ابھی تک آئے نہیں ہے" اور نفی میں جواب پانے کے بعد خود ہی کہتے "آج نہیں آئیں گے"۔ آج تو ان کو کوئی ضروری کام پیش آگیا ہوگا" مطلب یہ تھا کہ درس میں میری شرکت کی اطلاع نے مولانا کو مرعوب کر دیا اب وہ آکر درس دینے کی ہمت نہیں کر سکتے، طلباء بھی مولانا وہاب صاحب کے ان چبھتے ہوئے کلمات اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی غیر معمولی تاخیر پر بہت پیچ و تاب کھا رہے تھے کہ اتنے میں دیکھا سامنے سے حضرت والا کھادی کا لمبا سا کرتہ جس میں دو ایک جگہ پیوند بھی تھے، معمولی کھدر کا پائجامہ، سر پر دو پلی ٹوپی ایک ہاتھ میں پان کی ڈبیہ اور دوسرے ہاتھ میں عصا، چلے آرہے ہیں۔

(باقی آئندہ صفحہ ۴۶ پر)

کہنے کے لیئے ایک ہمہ گیر تحریک کے نتیجہ میں، مالٹہ کی سیاسی جیل میں اپنی عمر کے پانچ سال

(بقیہ حاشیہ گذشتہ صفحہ ۴۵ کا) حضرت مولانا اعزاز علی صاحب فرماتے تھے کہ حضرت شیخ الہند نور اللہ مرقدہ جب درسگاہ میں تشریف لائے تو مولانا وہاب صاحب نے ایک تیز نگاہ خاص اس مقصد سے ڈالی کہ مولانا مرعوب ہو جائیں لیکن درسگاہ سے باہر یہ انتہائی منکسر المزاج اور خاکسارانہ طور پر پیش آنے والا شخص درس گاہ میں قدم رکھتے ہی، غضب ناک اور جری شیر بنجاتا تھا، درس شروع ہوا تو مولانا وہاب نے گردن اٹھا کر نہایت کرخت و بلند آواز میں کہا "مولانا طحاوی نے تو اس موقع پر یہ کہا ہے" حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لب لہجہ کی اسی شدت کے ساتھ جواباً ارشاد فرمایا "مولانا امام فرمائیے کہ ابو حنیفہ کیا فرماتے ہیں، میں طحاوی کا مقلد نہیں بلکہ ابو حنیفہ کی تقلید کرتا ہوں"۔

سنا ہے کہ اس مختصر سے رد و بدل کے سوا سننے والوں نے تو کچھ اور نہ سنا، لیکن دیکھا یہ گیا کہ مولانا وہاب کی تنی ہوئی گردن اس کے بعد آہستہ آہستہ جھکنا شروع ہوئی اور پھر آخر وقت تک سر اٹھا کر نہ دیکھا۔ بلکہ ایک محویت و استغراق کے ساتھ خاموشی سے سنتے رہے۔

درس ختم ہو گیا اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تیز۔تیز قدم اٹھاتے ہوئے درسگاہ سے باہر تشریف لے گئے اور مولانا وہاب صاحب طلباء کے ہجوم میں چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے کہ "واللہ! حدیث پڑھانے کا اس شخص کو حق ہے۔" اور یہی مولانا وہاب ایک معمولی طالب کی طرح حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کر رہے تھے، میں نے سنا ہے کہ دار العلوم کے بعض ذی استعداد طلباء نے مولانا وہاب صاحب کو ٹٹولا تو منطق و فلسفہ دانی کے تمام دعاوی ہیچ در ہیچ ثابت ہوئے۔ واللہ اعلم۔

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ایسے واقعات اگر جمع کئے جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ انتظر

گذار سے تھے، اور جس کی تربیت نے ہندوستان میں آزاد پسند حریت خواہ لوگوں کا ایک ایسا مضبوط گروہ پیدا کر دیا تھا (اس انقلابی جماعت کی قیادت ہندوستان میں حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نے فرمائی اور آج بھی ہندوستان کی اقلیتی فرقہ کا کارواں اسی بوڑھے سپاہی کی راہ نمائی میں آگے قدم بڑھا رہا ہے) کہ بدیشی حاکموں کا متشددانہ سلوک اور بہیمانہ طرز عمل منزل مقصود کی جانب ان کا قدم بڑھنے سے روک سکا، اور نہ حاکمانہ اقتدار کی سخت گرفت ان کی ضمیر کی آواز کو دبا سکی اور آخر کار ان بے نواؤں کی مٹھی بھر جماعت کے مقابلہ میں دنیا کی سب بڑی حاکمانہ قوت کو اپنی قوت و طاقت کا پشتارہ اٹھا کر اس برِ عظیم کی حدود سے باہر ہو جانا پڑا۔

ہندوستان کے اتنے بڑے محسن کو بھلا دینا اس کے کارناموں کو فراموش کر دینا ہندوستان کی روایتی محسن کشی کی تاریخ میں ایک نہایت سیاہ باب ہے، افسوس صد افسوس۔ ؎

زندگی دشت نوردی میں گذاری جس نے
ایسے وحشی کو غزالانِ ختن بھول گئے

بہرحال یہ چند سطریں اپنے مجروح جذبات اور زخمی احساس کے تحت قلم سے بے اختیار نکل گئیں، ورنہ ان شکووں، اور گلوں کے لئے نہ یہ کوئی موقع اور نہ مقام۔ ع

بے قصد لکھ دیا ہے گلہ اضطراب میں

امید ہے کہ ناظرینِ قلم کی اس لغزش پر عفو و صفح سے کام لیں گے، بات یہ چل رہی تھی کہ وہی مولانا اعزاز علی صاحب جو بہت سے اساتذہ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے کے بعد اور ایک دو نہیں بلکہ بہت سے مدارس میں گھوم پھر کر دیوبند پہنچے تھے، آج ہندوستان

کی ایک دورافتادہ بستی میں واقع ہندوستان کی سب سے بڑی مرکزی یونیورسٹی سے دستارِ فضیلت لیکر نکل رہے تھے زندہ و پائندہ کرامت ہے کہ ہزارہا تشنگان علم جو علم وفضل کے چشموں پر سے اٹھکر پیاسے چلے آرہے تھے، ان کی علمی پیاس کے لئے سیرابی کا سامان دارالعلوم کے سوا اور کہیں میسر نہیں آیا۔ دارالعلوم کی اس زندہ کرامت کو دیکھتا ہوں تو یہ شعر بے اختیار زبان پر جاری ہوتا ہے۔ ؎

دوانے شہر سے یاں آگئے جی چھپائے ہیں
خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو

علوم دینیہ کی اس مرکزی درسگاہ نے سینکڑوں ایسے علماء و فضلاء پیدا کئے جو ایک ہی وقت میں گوناگوں خصوصیات کے مالک ہوتے، اگر میرے اس دعویٰ کی صحت مطلوب ہو تو دارالعلوم سے وابستہ چند شخصیتوں کی زندگی کو ذرا غور سے دیکھو تو نظر آئے گا کہ اگر ایک جانب وہ فضل وکمال کے مسند نشین ہیں تو دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ان کا وجود ایک مستقل شمع راہ ہے، اگر ادھر ان کے دن کے اوقات تصنیف و تالیف کے انبار لگا دیتے ہیں تقسیم ہیں تو دوسری طرف رات کے سناٹے میں ان کے نفوس قدسیہ نے، خاموش و ساکن فضاء کو روحانیت کی صداؤں سے متحرک کر رکھا ہے غرضیکہ دن اگر مشاغل دنیاوی میں گذرتے تو ان کی مبارک راتیں مناجات ربانی میں بسر ہوتیں کتنی عجیب تھی ان کی زندگی اور کس قدر دلکش ہے ان کا مرقع حیات ۔

خدا کرے کہ حجازی علوم کا یہ مرکز وحید جس نے اتنی گوناگوں خصوصیات کے حامل اور مختلف اوصاف کی جامع شخصیتیں پیدا کیں دنیا کے ظلمتکدۂ کفر و جہل میں ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے ۔ ؎

اے حجاز کے ساقی، تاابد رہے ترا میکدہ باقی
ترے بادہ نوشوں میں سوزِ بندگی بھی ہے مستی خودی بھی ہے

مدرسہ پورینی ضلع بھاگلپور میں تدریس

میں اپنے سلسلۂ بیان کو حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب کے ذکرِ خیر سے پھر وابستہ کرتا ہوں، دارالعلوم کے اکابر کا یہ معمول رہا ہے کہ انھوں نے اپنے یہاں سے فارغ ہونے والے طلبا میں ذی علم اور صاحب استعداد طلبا کو منتخب کیا اور باہر درس وتدریس کے لئے بھیج دیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ باہر چند سال گذارنے کے بعد یہ طلبا جب درس وتدریس کے تجرباتی مراحل سے گذر جاتے، اور ان کی تدریسی صلاحیتیں ٹھوس ہونے کے ساتھ اجاگر ہو جاتیں، تو ان کو دارالعلوم ہی میں اگر ضرورت وگنجائش ہوتی بلایا جاتا، حضرت العلامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا مدنی دامت برکاتہم۔ مولانا عثمانی مرحوم مغفور، اور اکثر وبیشتر علماءِ دارالعلوم کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اسی طرح جب مولانا اعزاز علی صاحب بھی دارالعلوم سے فارغ ہوئے تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جو مولانا پر شفقت وکرم کی نظر رکھتے تھے مولانا کی صلاحیتوں کو پاکر، مولانا کو مدرسہ نعمانیہ واقع پورینی مضافات بھاگلپور میں تدریس کا حکم فرمایا۔

اتنی دور دراز جگہ پر جانے کے لئے نہ مولانا تیار تھے اور نہ والد وغیرہ کی رائے تھی لیکن اپنے محبوب استاذ (شیخ الہند) کے حکم کی تعمیل کے لئے، بہار کے اس غیر آباد علاقہ میں سفر کرنے کے لئے خود کو آمادہ وتیار کر لیا۔

حضرت مولانا مدرسہ نعمانیہ میں پہنچے تو ان کی مخلصانہ جد وجہد، مسلسل عمل اور پُر خلوص سعی وکوشش کی وجہ سے اس غیر آباد ونامانوس علاقہ میں قال اللہ وقال الرسول کا

غلغلہ کچھ اس طرح بلند ہوا کہ ہر طرف سے طلبار کا ہجوم مستفیدین کی ایک بڑی جماعت بھا
اند اس کے قرب وجوار کے دوسرے علاقوں سے جوق درجوق نعمانیہ مدرسہ میں پہنچنے
مدرسہ کی تعلیم آپ کی وجہ سے نہایت ٹھوس ہونے لگی اور یہاں سے فارغ طلبا، ذی اس
ہونے کی بنا پر دوسری جگہوں پر امتیازی نظروں سے دیکھے جانے لگے ۔

مولانا نے پورینی میں قیام فرما کر مدرسہ کے مشاغل ومصروفیتوں کے علاوہ پور
کا وہ جاہل طبقہ جس میں جاہلانہ رسوم وعادات سرایت کر چکی تھیں اس کی اصلاح حا
کے لئے بھی زبردست جد وجہد کی ۔ اور آپ کی یہ خدمات اس قدر پسندیدہ نظروں
دیکھی گئیں کہ آج بھی ، بھاگلپور کے خاص وعام مولانا کی عقیدت ومحبت کے پاک لن
سے جوڑ جوڑ رہیں ۔ طلبا میں علمی ذوق پیدا کرنے کے لئے مدرسہ کے قوانین میں متعدد
مفید اصلاحات جاری کیں ، تقریر وتحریر کی صلاحیت طلبا میں پیدا کرنے کے لئے ایک
ادارہ قائم کیا جس میں طلبا کو تقریر سکھائی جاتی تھی ، انشا پردازی کے لئے بھی ایک ایسی
ہی انجمن قائم کی ۔ اور طلبا میں انشا پردازی کا شوق پیدا کرنے کے لئے بہت سے مضا
لکھکر ، طلبا کے نام سے ہندوستان کے اخبارات ورسائل میں شائع کرائے ، اخبا
"وفادار" لاہور ان مضامین کا خاص طور پر قدر دان رہا ، غرضکہ بہار کے اس علاق
میں ، مولانا کے قیام سے وہاں کی علمی زندگی میں ایک مفید اور نئے باب کا آغاز ہوا

اسی دوران میں مدرسہ کی اپنی عمارت کا انتظام اہل خیر لوگوں کی توجہ ، اور
مولانا کی سعی وکوشش سے ہونا قرار پایا اور حضرت مولانا کی نگرانی میں مدرسہ کی
جدید عمارت بنکر تیار ہوگئی ، ارباب بست وکشاد کی جانب سے مدرسہ کو جدید عما
میں منتقل کرنے کے موقع پر ، ایک شاندار تقریب کا انتظام کیا گیا ۔ اس وسیع اجلا

ہندوستان کے اکثر مشہور علماء نے شرکت کی، دیوبندی جماعت میں سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ شرکت کے لئے تشریف لے گئے، مولانا اعزاز علی صاحب نے اس جلسہ کو کامیاب بنانے کے لئے انتھک کام کیا اور جلسہ کی تمام کامیابی مولانا کی خصوصی خدمات کی مرہون منت ہے۔ بہت سے مضامین تھوڑی سی مدت میں لکھکر طلباء سے برسرِ اجلاس پڑھوائے اور خود ایک طویل قصیدہ لکھا جس کا مطلع تھا ؎

یا خدا اہل پورینی پہ ہے تیری رحمت
ایسی گمنام سی بستی کو عطا کی شہرت

اس پورے قصیدے کے ہر ہر شعر نے حاضرین میں ایک رقت و نسبت پیدا کی کہ تمام مجمع پر بے اختیار گریہ طاری ہوگیا۔ خصوصًا مولانا سہول صاحب بھاگلپوری پر بہت دیر تک یہ کیفیت رہی۔

مدرسہ نعمانیہ سے ترک تعلق۔ اور افضل المدارس شاہجہانپور میں مدرسی

مولانا کی جد و جہد، سعی و کوشش، مسلسل عمل سے مدرسہ برابر ترقی کی جانب قدم بڑھا رہا تھا، اور مدرسہ کے دیکھنے والے اس کے شاندار و تابناک مستقبل کی توقعات قائم کرنے لگے تھے کہ اسی زمانہ میں مدرسہ مذکور کا آخری جلسہ ہوا، اس اجلاس میں علمائے دیوبند کے علاوہ پورینی کے بعض شوریدہ سر و شوریدہ پشت عوام کے اصرار پر بعض بدعتی علماء کو بھی شریک کیا گیا جلسہ شروع ہوا تو سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اختلافی مسائل کو چھیڑ کر مناظرہ و مجادلہ کی خطرناک صورت حال پیدا کردی گئی۔ فضاء میں اس قدر ہیجان برپا کیا گیا کہ علماء دیوبند کی تمام امن پسندانہ و صلح جو کوششیں رائیگاں گئیں، صورت حال زیادہ سے زیادہ خراب ہوتی جاتی تھی۔ اور

اصلاح حال کی کوئی بھی کوشش کامیاب نہ ہوتی تھی اس لئے مولانا اعزاز علی صاحب مدرسہ نعمانیہ سے مستعفی ہوکر شاہجہانپور اپنے مکان واپس چلے آئے۔

مولانا کی علیحدگی سے مدرسہ نعمانیہ کو سخت نقصان پہنچا اور اس کی علمی ترقی دفعتًہ پستی و تنزل سے بدل گئی اور وہی مدرسہ جو چند روز پہلے ترقی کی جانب تیزی سے جا رہا تھا اب اس کی تیز رفتاری کا رخ تنزل کی طرف تھا۔ اہل پورینی اپنی اس لغزش پر آج تک متأسف و مغموم ہیں۔

بہرحال مولانا مدرسہ نعمانیہ سے علیحدہ ہوکر شاہجہانپور اپنے مکان پر مقیم کسی مناسب جگہ کی تلاش میں تھے، کہ مولانا کے والد نے جو کبرسنی کی وجہ سے چلنے پھرنے سے تقریبًا مجبور ہو چکے تھے اصرار کیا کہ شاہجہانپور ہی قیام کریں۔ والد مرحوم کی اس خواہش اور اصرار پر مولانا نے شاہجہانپور مدرسہ افضل المدارس سے اپنا تدریسی سلسلہ قائم کرلیا اس مدرسہ کا نہ کوئی وقف تھا اور نہ عام چندہ کی کوئی شکل تھی، صرف ایک باہمت مخیر و مستطیع انسان کی کوشش و توجہ سے مدرسہ چل رہا تھا، کچھ عرصہ کے بعد ان صاحب کا انتقال ہوگیا اور ورثاء نے اس انتظام کو باقی و قائم رکھنے سے معذرت کردی، شاہجہانپور کے مسلمانوں نے اگرچہ مدرسہ کو باقی رکھنے کے وعدے کئے اور تھوڑا بہت اس سلسلہ میں کام بھی کیا لیکن مدرسہ کی ضروریات پوری نہ ہوسکیں۔ اس عرصہ میں کئی ماہ درمیان میں ایسے گذرے کہ مولانا اپنی قلیل تنخواہ بھی نہ لے سکے اور حسبۃً للہ حالات کی ناخوشگواری کے باوجود کام کرتے رہے، آخر کار سخت مجبور ہوکر مولانا نے مدرسہ سے سبکدوشی اختیار کرلی۔

اس مدرسہ میں مولانا کی مدت تدریس تین سال ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے

بہرحال حضرت مولانا کی افضل المدارس سے علیحدگی ان کے تابناک و روشن مستقبل اور خوش گوار و خوش آیند حالات کی ایک تمہید تھی، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مولانا کے دیرینہ کرم فرما، اور شفیق استاذ مولانا محمد سہول صاحب بھاگلپوری جن کی رائے کو دارالعلوم کے انتظامی معاملات میں دخل تھا۔ خصوصًا مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم دارالعلوم، ان کی اصابت رائے، دوراندیشی و دوربینی کے قائل تھے اور مولانا بھاگلپوری کے مشوروں کی اکثر قدر کرتے تھے تو مولانا بھاگلپوری نے اس اعتماد پر کہ مولانا عثمانی میری اس تجویز سے یقینًا اتفاق کریں گے، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب کی افضل المدارس سے علیحدگی کے بعد۔ دارالعلوم دیوبند میں مولانا کی مدرسی کے لئے سعی و کوشش کی اور اس سلسلہ میں یہاں کے ارباب انتظام سے گفتگو کرتے رہے۔

مولانا بھاگلپوری کی اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۳۳۰ھ کے اوائل میں دارالعلوم دیوبند کی منتظمہ کمیٹی نے مولانا اعزاز علی صاحب کا تقرر پچیس روپیہ (۲۵) کے مشاہرہ پر کردیا۔ حضرت مولانا اُن دنوں شاہجہانپور ہی میں تھے کہ اہتمام دارالعلوم ہی کی جانب سے تقرر کا اطلاع نامہ مولانا کو پہنچا۔ حضرت مولانا نے دارالعلوم میں تدریس کو دین کی ایک نہایت اہم خدمت تصور کرتے ہوئے دیوبند آنے کا ارادہ فرمالیا، اس وقت حضرت الاستاذ دارالعلوم کے ابتدائی مدرس مقرر کئے گئے تھے اور مدرسہ کی جانب سے جو کتابیں آپ کو پڑھانے کے لئے دی گئیں تھیں وہ بھی ابتدائی تھیں

یاد پڑتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے مجھ سے فرمایا تھا کہ دارالعلوم میں میری

مدرسی کے ابتدائی دور میں علم الصیغہ، مفید الطالبین، نورالایضاح یہ کتابیں تدریس کے لئے مجھکو مدرسہ کی مجلس علمی کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔

دیوبند پہنچنے کے بعد مولانا نے اپنے استاذ مولانا بھاگلپوری کے ساتھ ایک ہی کمرہ[۱] میں قیام فرمایا، مولانا فرماتے تھے کہ جگہ کی تنگی کے باوجود مولانا بھاگلپوری نے مجھکو اپنے سے علیحدہ کرنا گوارا نہیں کیا اور میرے ساتھ شب و روز غیر معمولی جد وجہد کر کے بہت جلد دارالعلوم کے کامیاب اساتذہ میں میرا اشمار کرادیا۔

حضرت مولانا نے خاکسار کے سامنے بارہا اس کا اعتراف فرمایا کہ "دارالعلوم میں میری تدریسی بنیادوں کی استواری اور استحکام مولانا بھاگلپوری کی شفقت و عنایت کا مرہون منت ہے۔ ورنہ اس وقت کے دارالعلوم میں اتنی جلد ایک مقام پیدا کر لینا سخت دشوار تھا۔"

ریاست حیدرآباد میں

حضرت مولانا دارالعلوم میں تدریس میں مشغول تھے، سخت محنت، شب و روز

---

[۱] ابھی حال میں خاکسار نے ارادہ کیا تھا کہ دارالعلوم کے اکابر اساتذہ اور مشہور شخصیتوں نے طالب علمی کے زمانہ میں جن کمروں میں قیام کیا تھا، ان کی تحقیق کی جائے۔ اسی سلسلہ میں ایک مجلس میں حضرت مولانا سے بھی دریافت کیا کہ "آپ نے دارالعلوم میں طالب علمی کے وقت میں کون سے کمرہ میں قیام فرمایا تھا۔"؟ جواباً ارشاد فرمایا کہ "مولوی صاحب وہ کمرہ جس میں میرا قیام رہا ہے منہدم کرا کر دارالعلوم کی مسجد میں لے لیا گیا۔" اس پر عرض کیا گیا کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حجرے بھی مسجد نبوی میں شامل کر لئے گئے تھے۔" میری اس عرض پر ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا کہ "جی ہاں یہ بھی ایک لطیفہ ہے۔"

کی جد وجہد نیز بعض اکابر اساتذہ کی توجہ سے مولانا کا شمار دارالعلوم کے ممتاز اساتذہ میں ہونے لگا تھا، اور ان کی علمی استعداد پر اعتماد کرتے ہوئے مجلس علمیہ نے درمیانی درجہ کی کتابیں، تدریس کے لئے ان کے یہاں بھیجدی تھیں کہ اسی دوران میں ریاست حیدرآباد کی جانب سے دارالعلوم کے صدر اہتمام مولانا حافظ احمد صاحبؒ کو ریاست کا مفتی اعظم بنا کر بلا یا گیا، کیونکہ حافظ صاحبؒ اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے امور متعلقہ کے انجام دینے سے معذور تھے اس لئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمہ کے مشورہ سے دیوبند سے حیدرآباد روانگی کے وقت میں حافظ صاحب نے مولانا اعزاز علی صاحب کو اپنے ہمراہ لے جانا چاہا اور حضرت مولانا حافظ صاحبؒ و مولانا عثمانیؒ کے اصرار پر حیدرآباد جانے پر مجبور ہوئے اور تقریباً نو سال دارالعلوم میں تدریس کے بعد ۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا کو دارالعلوم چھوڑنا پڑا۔

ریاست حیدرآباد کے مفتی اگرچہ حافظ صاحب مرحوم ہی تھے، لیکن ریاست کے تمام امور متعلقہ دارالافتا، حضرت مولانا ہی انجام دیتے تھے، حافظ صاحب نے ایک مرتبہ ریاست کے اعلیٰ حکام اور ذمہ دار افسران کے ذریعہ سے مولانا کا مشاہرہ، ریاست کی طرف سے جاری کرانا چاہا تھا لیکن اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی، اس تمام عرصہ میں حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی جیب خاص سے حضرت مولانا کو ایک معمولی رقم مشاہرہ کے طور پر دیتے رہے، اور اس کے بعد ایک موقعہ پر کوشش کر کے ریاست کی جانب سے مولانا کا پچاس روپیہ ماہوار وظیفہ کرا دیا تھا۔

حضرت مولانا کو حیدرآباد میں یہ خدمت انجام دیتے ہوئے ابھی ایک ہی سال کا عرصہ ہوا تھا کہ ۱۳۴۰ھ میں، مولانا حافظ احمد صاحب کو جبکہ وہ حیدرآباد سے دیوبند کا سفر کر رہے تھے

جان، جان آفریں کے سپرد کردینا پڑی۔ حافظ صاحب کے اس اچانک سانحہ ارتحال پر
بظاہر حضرت مولانا کے حیدرآباد میں قیام کا کوئی باعث نہ تھا اور خود مولانا بھی اس سلسلہ
میں تردد میں مبتلا تھے کہ دارالعلوم کے شعبۂ افتاء میں مولانا عزیزالرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ
اللہ علیہ کی علیحدگی کی وجہ سے کسی مناسب آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس پر ۱۳۴۰ھ
کی مجلس شوریٰ و انتظامی کمیٹی میں مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نے، حضرت مولانا
اعزاز علی صاحب کا نام نامی اس اہم عہدہ اور ذمہ دارانہ خدمت کے لئے پیش کیا۔
کیونکہ حضرت مولانا افتاء نویسی کی خدمت کو اس سے قبل خود دارالعلوم میں اور اس کے
بعد ریاست حیدرآباد میں بڑی نیک نامی کے ساتھ انجام دے چکے تھے اس لئے مولانا
عثمانی مرحوم کی اس تجویز سے انتظامی کمیٹی کے ہر رکن نے اتفاق کیا اور اس جگہ پر باقاعدہ
حضرت مولانا کا تقرر کرکے اس کی اطلاع حیدرآباد میں مولانا کو دیدی گئی۔

دارالعلوم کے صدر مفتی

حضرت مولانا نے حیدرآباد سے اگرچہ اس اہم جگہ کی خدمت انجام دینے سے بار
بار معذرت فرمائی، لیکن اہتمام کے اصرار اور مولانا عثمانی مرحوم کے حکم پر حیدرآباد سے
دارالعلوم دیوبند کے صدر مفتی کی حیثیت سے ۱۳۴۰ھ میں حضرت مولانا نے دیوبند کا سفر فرمایا
اور اس طرح ۱۳۳۰ھ سے لیکر آج جب کہ ۱۳۷۲ھ ہے درمیان میں ایک سال نکالنے کے بعد
اکتالیس سال کی طویل مدت استاذ محترم کو دارالعلوم کی خدمت کرتے ہوئے بیت گئی
علم الصیغہ اور نورالایضاح کے پڑھانے پر مامور ہو کر آنے والا ابتدائی مدرس، ایک
گمنام شخصیت، آج دارالعلوم کی درسگاہ حدیث کا صدر نشین، اور ہندوستان کے
مشہور، منتخب، ممتاز علماء میں سے ایک ہے۔ اس اکتالیس سال کے طویل عرصہ میں، دنیا

ہیں سیکڑوں انقلابات کے ساتھ خود دارالعلوم کے مختصر سے احاطہ میں ہزارہا انقلابات آئے، سینکڑوں فتنے اٹھے، جن سے متاثر ہوکر بڑے بڑے اولوالعزم اپنی جگہ سے ہٹنے پر مجبور ہوئے۔ استقلال و عزیمت کے پہاڑ اپنی جگہ سے منتقل ہوتے رہے لوگوں کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہوتا رہا۔ غرضیکہ ہر چیز میں ایک تغیر، ایک انقلاب، ایک تبدیلی قدم، قدم پر واقع ہوتی رہی، لیکن استاذ محترم کی ذات دارالعلوم کی وہ واحد شخصیت ہے کہ انتہائی خاموشی، سکون، استقلال، اخلاص، عزم ثبات قدم کے ساتھ علم کی خدمت میں شب و روز لگی ہوئی ہے، وقت کا کوئی انقلاب اس کو اپنی جگہ سے نہ ہٹا سکا، آندھیوں کے جھکڑ، فتنوں کا ہجوم، تغیرات کے سیلاب ان کے قدموں میں ادنیٰ سی لغزش بھی پیدا نہ کر سکے، وقت کی گردشوں نے سبکو بدلکر رکھدیا لیکن اس جواں ہمت نے اپنی عزیمانہ قوتوں سے وقت کو اور اس کی تمام طاقتوں کو اپنے بے پناہ عزم و استقلال سے مسخر کرلیا

غرضیکہ اکتالیس سال پہلے دارالعلوم کی زمین پر قدم رکھنے والا یہ علم وادب کا گوہر نایاب، فضل وکمال کا دمکتا ہوا موتی آج بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ آج سے اکتالیس سال پہلے تھا، اس کے نہ بدلنے والے عزم اور نہ شکست کھانے والی ہمت و حوصلہ کو دیکھکر کہنا پڑتا ہے۔ ؎

واعظ ز دیں بر آمد و صوفی ز اعتقاد
ترساں ہوی شد۔ عاشق ہماں کہ ہست

دارالعلوم کی اس اکتالیس سالہ زندگی میں اس بابائے دارالعلوم نے ہزارہا علمی کام کیئے، اپنے دامن تربیت سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزارہا کی تعداد میں علماء پیدا کیئے، ان تمام کارہائے نمایاں کی تفصیل چند صفحات میں پیش کرنا کیسے ممکن ہے، تاہم

حضرت الاستاذ کی زندگی کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنے کی سعی اس عاجز کا قلم کریگا

خاکسار اس سلسلہ میں سب سے پہلے حضرت الاستاذ کی درسی خصوصیات مختصر طور پر آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہے، کیونکہ حضرت مولانا کی ذات گرامی ایک علمی زندگی ہے اور ان کا سب سے بڑا کارنامہ دارالعلوم میں طویل تدریسی خدمات ہیں جن کے فیض سے، ہند و پاکستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلامی کا گوشہ گوشہ فیضیاب ہوا ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے مولانا کی درسی خصوصیات ہی کو ذکر کیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

درسی خصوصیات

راقم السطور نے کیونکہ کئی سال تک مختلف علوم وفنون کی کتابیں مولانا سے پڑھی ہیں، اس لئے کوشش کروں گا کہ اجمالاً ان کی تدریس کی ہر خصوصیت کو کچھ عرض کر دیا جائے آج دنیائے علم میں ایسے فاضل اساتذہ موجود ہیں جو ہر فن کی آخری کتاب منتہی طلبار کو پڑھا دیں اور اس کے مضامین و مطالب کو سہل طریقہ پر ان کے دماغوں میں اتار دیں لیکن ان سے جب یہ کہا جائے کہ مبتدی طلبار کو ابتدائی اسباق یا درس نظامی کی پہلی کتاب پڑھانا ہوگی تو یقیناً وہ اس سے پہلوتہی کریں گے اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے پڑھائیں گے بھی تو یہ بہت مشکل ہے کہ وہ اس کتاب کا طلبار اور مخاطبین کی استعداد کے مطابق حق ادا کر سکیں، لیکن حضرت الاستاذ کی یہ سب سے پہلی اور نمایاں خصوصیت ہے کہ وہ جس وقت میں دیوان متنبی، حماسہ، قاضی بیضاوی، ہدایہ آخرین، ابو داؤد شریف وغیرہ کا درس دے رہے ہوں انہیں ایام میں ان کے یہاں میزان ابن عقیل، ملا جامی، نفحۃ العرب، مفید الطالبین، ملتقی الابحر کا درس بھی مبتدی

طلباء کو دیا جا رہا ہے اور اس طرح سے کہ ان بتدی طلباء اور کم عمر بچوں کو دوسرا استاذ پڑھانے اور سمجھانے سے قاصر ہے، غرضیکہ ابتدائی تعلیم دینے میں بھی وہ ایسے ہی کامیاب ہیں جس طرح کہ انتہائی تعلیم میں، آج ہند و پاکستان میں ایسے بے شمار طالب علم ہیں جنھوں نے ابتدائی تعلیم صرف و نحو مولانا سے پاکر اپنی تعلیم کی پختہ و استوار بنیادیں قائم کیں ہیں۔

دارالعلوم دیوبند جو عربی اور اسلامی علوم و فنون کی ایک ممتاز درسگاہ ہے یہاں مولانا کے تشریف لانے سے قبل مقامات حریری، متنبی، حماسہ وغیرہ کی تعلیم ہوتی تھی اور اچھی تعلیم ہوتی تھی، لیکن جس طرح حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے درس حدیث میں اپنے تبحر علمی، وسعت مطالعہ، خداداد ذہانت و ذکاوت، ممتاز قوت حافظہ کی وجہ سے ایک ایسی نمایاں خصوصیت پیدا کی کہ دارالعلوم کی سابقہ تاریخ اس سے قطعًا خالی تھی، اسی طرح حضرت شیخ الادب نے ادب کی کتابوں کے پڑھانے میں بیان لغت، ترکیب نحوی، علم صرف، علم اشتقاق علم معانی و علم بیان کا ایسا کامیاب اضافہ فرمایا جو پہلے کسی کے درس میں نہ تھا۔ چنانچہ آج کل ملک کے اطراف و اکناف میں مولانا ممدوح کے تلامذہ اُن کے اس طرز تعلیم کو فن ادب کی تعلیم میں مضبوطی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔

نظم عربی

نظم عربی کے پڑھانے میں یہ خاص ملکہ ہے کہ وہ نظم کو اس طرح نثر کر دیتے ہیں کہ طالب علم کو اس کے بعد ترجمہ کرنے اور مطلب کے سمجھنے میں استاد کی امداد کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، متنبی کے قصائد کی بہاریہ تشبیب کو کچھ اس طرح پڑھاتے ہیں کہ موسم بہار اپنی تمام رنگینیوں اور شادابیوں کے ساتھ پڑھنے اور سننے والوں کے سامنے آ کھڑا

ہوتا ہے،

حماسہ کا باب الحماسۃ پڑھنے والے آج بھی اپنے قلوب میں شجاعت و بہادری کی حرارت پا رہے ہیں، حزن و ملال، غم انگیزی و غم آفرینی کے موقعوں پر انکا لب و لہجہ خود غم انگیز ہوجاتا ہے غرضیکہ لب و لہجہ کا تغیر و تبدل ان کے بشرہ کی بدلتی ہوئی کیفیات ان کے کامیاب طرز تعلیم میں خاص دخل رکھتی ہیں۔

فقہ

علم فقہ میں چوٹی کی کتاب ہدایہ آخرین ہے حضرت مولانا نے اس کتاب کا درس نہایت کامیابی کے ساتھ تقریباً چالیس سال دیا ہے، ہدایہ آخرین ایسی مشکل کتاب کی اہمیت ہر اس اہل علم پر واضح ہے جس نے اس کو پڑھا یا پڑھایا ہے[1]، مولانا کا درس اس طرح نہیں ہوتا کہ ایک دو صفحے کتاب کے پڑھوائے اور طویل سی ایک تقریر کردی جس کا تعلق کم از کم کتاب سے تو کوئی نہ ہو۔ بلکہ ان کا انداز درس یہ ہے کہ وہ علمی مسئلہ کو مسئلہ کی طرح سمجھاتے ہیں، اس پر جس قدر اشکال ہوں ان کو بھی ساتھ ساتھ حل کرتے چلے جاتے ہیں، فن کی گہری باتیں بھی مسئلہ کے ساتھ چل رہی ہیں، ایسی لگی بندھی تقریر جس میں

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی خاکسار سے ایک مرتبہ کہتے تھے کہ "میں جس زمانہ میں دارالعلوم میں تحصیل علم کررہا تھا تو ایک صاحب (فقیر کو مولانا فریدی کا ذکر کردہ نام یاد نہیں رہا) جن کو علوم پر مجتہدانہ بصیرت و عبور کا دعویٰ تھا، اور انکا یہ دعویٰ ایک حد تک صحیح بھی تھا مولانا اعزاز علی صاحب کے درس ہدایہ آخرین میں آئے بہت دیر تک بڑے غور کے ساتھ مولانا کا درس سنتے رہے آخر میں اٹھے تو طلباء کے ہجوم میں کھڑے کہہ رہے تھے "واللہ! اس شخص کو فقہ پر فقیہانہ بصیرت حاصل ہے"۔ انظر

بیش بہا مضامین بکثرت ہوتے ہیں اور اس سے ادنیٰ و اعلیٰ، متوسط، استعداد کے طلباء سب ہی بہرہ یاب ہوکر اٹھ رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولانا ممدوح سے پڑھی ہوئی کتاب ہر طالب علم کو محفوظ رہتی ہے، اور وہ اس کے پڑھانے پر بے دھڑک قادر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کو لوگ شیخ الادب کہتے ہیں اور جانتے ہیں، لیکن فقیر کا اس سلسلہ میں یہ خیال ہے کہ وہ ادب پر تو قدرت رکھتے ہی ہیں لیکن فقہ سے ان کی طبعی مناسبت نے ان کو اس فن پر جس حد تک قابو یافتہ کردیا ہے اس کی نظیر مشکل سے ملے گی، مسائل فقہ میں ایسی موشگافیاں کرتے ہیں کہ عقل حیران رہ کر مولانا کی ذکاوت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

درس حدیث

مولانا ممدوح نے ایک طویل عرصہ تک حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ شریف کا درس دیا ہے، حدیث کے پڑھانے کا وہ شخص زیادہ مستحق ہے جس کو فقہ میں کامل مہارت ہو، عبادات، معاملات، خصوصاً بیوع میں اکثر اہل درس، درس کا حق ادا نہیں کرتے ہیں یہ فقہ سے ایک گونہ ناواقفیت اور عدم مناسبت کا لازمی نتیجہ ہے، لیکن مولانا کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ ان کے درس حدیث میں معاملات کی تشریح۔ مسائل کی تفصیل، فقہی عبارتوں کی تنقیح عبادات سے زیادہ ہوتی ہے۔ مشکوٰۃ شریف کے درس کے زمانہ میں انھوں نے مشکوٰۃ اور حدیث سے متعلق اکثر متون شروح کا عموماً اور ملا علی قاری کی مشہور شرح مشکوٰۃ مرقاۃ کا بارہا از اول تا آخر مطالعہ کیا ہے۔

آج کل حدیث میں مولانا ممدوح کے یہاں ابوداؤد شریف کا درس ہوتا ہے۔ حدیث کی اس اہم کتاب کے درس میں، روایت و درایت کے اعتبار سے حدیث کا کوئی

گوشہ تشنہ نہیں رہتا۔ صحاح ستہ کی اس مشہور کتاب ہیں سند کے جھگڑے، ابوداؤد کی اپنی تحقیق اور ذاتی رائے کا اجمالی بیان طلباء کے لیے بڑے دشوار ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن مولانا کی درسگاہ میں پہنچکر یہی لاینحل عقدے اس طرح حل ہوتے ہیں کہ عام طلباء ان کو سہل اور عام فہم سمجھنے لگتے ہیں۔ حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے مولانا کے یہاں شمائل ترمذی ہوتی چلی آئی ہے، ظاہر ہے کہ شمائل میں لغات عربیہ کے حل کی کس قدر ضرورت ہے، مولانا ممدوح نے اس کے درس کا حق ہمیشہ اس طرح ادا کیا ہے کہ حدیثی نکات کے ساتھ، حل لغت، ترکیب نحوی۔ بامحاورہ ترجمہ تدارفع حدیث علی وجہ الاتم برابر ہوتا رہتا ہے۔

وقت کی پابندی

مولانا کی ایک اور بڑی خصوصیت جس میں مولانا کی نظیر کم از کم دارالعلوم میں تو آج تک کوئی ملتی نہیں وہ وقت کی پابندی ہے، یہ وقت کی پابندی جو درس کے لئے اور طلباء و معلم کے لئے ایک ضروری امر ہے، مولانا کا طغرائے امتیاز ہے، سردی ہو یا گرمی، جاڑہ ہو یا موسم برسات، بیماری ہو یا تندرستی، شادی ہو یا غم، بہرحال مولانا کا معمول یہ ہے کہ سبق ہونا چاہیئے، کمرہ میں گھڑی موجود ہے ابھی درس گاہ میں پہونچنے کے لئے کم از کم دس منٹ باقی ہیں، مولانا نے اپنی بغل میں کتاب دبائی اور کمرہ کو مقفل کرنا شروع کیا، ابھی پانچ منٹ باقی ہیں مگر مولانا کا اضطراب نہ پوچھیئے کبھی ادھر ٹہل رہے ہیں، کبھی اُدھر۔ مدرسہ کے گھنٹہ پر چوٹ پڑی اور مولانا نے درس گاہ کی طرف عجلت کے ساتھ قدم اٹھانا شروع کیئے، گھنٹہ بجانے والا ابھی تک گھنٹہ بجانے سے فارغ نہیں ہوا کہ وہ درس گاہ پہنچ گئے اگر کسی طالب علم نے عبارت کے پڑھنے میں تاخیر کی تو پھر "جی، جی" کے تقاضوں سے طالبعلموں

کے ہوش گم ہوگئے ہیں، گھنٹہ کی آواز ابھی فضاء میں گونج رہی ہوتی ہے کہ طالب علم عبارت کا اچھا خاصہ حصہ پڑھکر فارغ ہوچکا ہوتا ہے فضاء میں سکون پیدا ہوتے ہی ان کی گرجدار آواز نے درسگاہ کی پرسکون فضاء میں ایک تلاطم پیدا کردیا، پورے ساٹھ منٹ بلا مبالغہ سبق ہوا، ادھر گھنٹہ بجانے والے نے گھنٹہ بجایا ادھر مولانا کی کتاب بند ہوگئی اب دوسری جماعت آئی طالب علم بدحواسی کے ساتھ دوڑکر درسگاہ میں پہونچ رہے ہیں اس پر درس گاہ میں پہنچکر کیا دیکھتے ہیں کہ کسی طالب علم نے مولانا کی اضطراری کیفیتوں اور ہر ادا سے ایک تقاضا پاتے ہوئے کتاب کی عبارت شروع کردی اور سابق کی طرح فضاء میں سکون ہوتے ہی، بشاشت، تازگی۔ انشراح کے ساتھ سبق کی تقریر پھر سے شروع ہوگئی۔

میں نے دیکھا ہے کہ انھوں نے چھ چھ، آٹھ آٹھ گھنٹے مسلسل اسی بشاشت و نشاط سے درس دیا ہے، ہجوم افکار، اور گوناگوں مشاغل، کبرسنی، اور ضعف قویٰ کے باوجود آج بھی مولانا کی وقت کی یہ پابندی نوجوانوں کو حیرانی میں ڈالدینے کے لئے کافی ہے۔

بارہا مولانا ممدوح ایسے حال میں سبق میں تشریف لائے ہیں کہ ان کو سخت

سلہ حضرت مولانا نے مجھ سے بارہا فرمایا کہ آج کل معلم اور متعلم دونوں کے دونوں پڑھنے پڑھانے سے گھبراتے ہیں۔ میں دارالعلوم میں آیا تھا تو فجر کی نماز کے بعد سے سبق شروع کرتا تو درمیان میں صرف ضروریات نماز وغیرہ کے لئے اٹھتا۔ اور یہ درس کا سلسلہ شب کو بارہ بجے تک قائم رہتا، مولانا کا اب بھی یہی عالم ہے۔ ع

خدا رائے جواناں کہ پیر جوانم

بخار ہے لیکن درس جاری ہے، وہ سخت سے سخت بیمار ہوتے ہیں، تمام اطبّاء کے معالجین اور متعلقین کا اصرار ہوتا ہے کہ "مولانا اس وقت سبق نہ پڑھائیے، مرض کے بڑھ جانے کا امکان ہے۔"

لیکن وہ اس سلسلہ میں کسی کی نہیں سنیں گے اور ایسی حالتوں میں وہ اکثر فرماتے ہیں کہ "مولوی صاحب اسی میں میرے لئے شفا ہے" اور پھر دیکھتے ہیں بھی یہی آیا کہ جب تک وہ چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں بیمار ہیں اور جس وقت درس گاہ میں پہنچ گئے، سبق شروع ہو گیا تو ان کی ناسازی مزاج، علالت، کمزوری، اور ضعف سب کچھ ختم ہو جاتا ہے،

شاید میری آنے والی سطور کو پڑھنے والے الیقین کی نگاہوں سے نہ دیکھ سکیں لیکن جو کچھ پیش آیا اس کے لکھنے پر مجبور ہوں، اور جنھوں نے مولانا سے پڑھا، یا اُن کو قریب سے دیکھا ہے وہ میرے بیان کی تصدیق کریں گے کہ پچھلے دنوں جب ہم سب مولانا کی اہلیہ محترمہ کی تدفین سے عصر کے قریب فارغ ہو کر لوٹے تو مغرب کے بعد شمائل ترمذی پڑھانے کے لیے درس گاہ میں موجود تھے، ہم سب حیران تھے کہ آج بھی ان کے لب ولہجہ میں نہ کوئی فرق، اور نہ درس کی سرگرمی میں کوئی تغیر، وہ اسی جوش وخروش کے ساتھ مسلسل پڑھائے چلے جا رہے تھے۔

ان کی درسی خصوصیات کی تفصیل ایک وسیع باب ہے اس مختصر سی کتاب کے چند صفحات میں اس تفصیل کو کیسے سمیٹا جا سکتا ہے۔ تاہم ان مختصر سی باتوں کو سامنے رکھ کر ان کی درسی خصوصیات کا ایک مکمل نقشہ بنانے والا بنا سکتا ہے۔

تعلیقات وتالیفات

دنیائے علم پر حضرت شیخ الادب مدظلہٗ کا ایک اور قابلِ ذکر و گراں قدر احسان یہ ہے کہ انھوں نے، درسِ نظامی کی ان کتابوں کا جن کا عبارت کے اختصار، ابہام اغلاق یا مضامین و مطالب کی دقت و باریکی کی وجہ سے طلبار کے لئے سمجھنا اور معلمین کے لئے سمجھانا مشکل تھا، یا وہ درسی کتابیں جن کے قابلِ اعتبار اور سہل المأخذ حواشی موجود نہ تھے، بڑی کاوش و تحقیق کے بعد ان کے حواشی لکھے اور اپنے طویل تدریسی تجربہ کی بنا پر ہر حیثیت سے ان کو اس درجہ سہل اور عام فہم بنادیا کہ اب ذی استعداد طلبار کے علاوہ ادنیٰ صلاحیت و استعداد کے طالب علم بھی سہولت کے ساتھ ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

مولانا ممدوح کے ان حواشی کی عام مقبولیت اور پسندیدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ ایک فن کے مسلسل مطالعہ اور اس فن کی متعلقہ کتابوں کی متواتر درس و تدریس نے حضرت مولانا کو اس کے ناقابلِ فہم اور مشکل مقامات پر خوب مطلع کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ وہ طالب علم کی نفسیات اور اس کی طلب سے بھی اچھی طرح واقف تھے، اس لئے حاشیہ کے لئے اُن کا قلم اٹھا تو ان ناقابلِ فہم مقامات کو جن پر دوسرے محشی اپنے مخصوص تسامح سے کام لیتے ہوئے گذر جاتے ہیں مولانا نے مکمل طور پر حل کیا۔

مولانا کے یہ حواشی اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے طبقۂ اول کے علماء کے یہاں بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں، خاکسار نے مدارس کے اکثر معلمین کو دیکھا ہے کہ وہ تدریس کے وقت میں مولانا ہی کے حواشی سے استفادہ کرتے ہیں۔ اب میں

ذیل میں مولانائے محترم کی تالیفات وتعلیقات کی ایک مختصر سی فہرست پیش کرتا ہوں۔

حاشیہ نورالایضاح

افضل المدارس شاہجہانپور کے قیام کے زمانہ میں مولانا کو فقہ کی مشہور کتاب "کنز الدقائق" کے حاشیہ کا خیال ہوا تھا۔ لیکن بعض اسباب وموانع کی بناء پر مولانا اپنے اس ارادہ کی تکمیل نہ کرسکے تھے۔ افضل المدارس سے ترک تعلق کے بعد جب وہ دارالعلوم دیوبند میں مدرس ہو کر آئے تو ایک مجلس میں انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ مہتمم دارالعلوم سے اپنے اس ارادہ کا اظہار کیا، مولانا عثمانی مرحوم نے ہمت افزائی کی راہ سے فرمایا کہ اگر کنز کا حاشیہ لکھدیا گیا تو "مطبع قاسمی" کی جانب سے اس کو شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی،

مولانا نے کنز کے تحشیہ کی تیاری شروع ہی کی تھی کہ دارالعلوم کے مشہور استاذ اور مولانا عثمانیؒ کے قریبی دوست مولانا سراج احمد صاحب رشیدی میرٹھی نے، مولانا اعزاز علی صاحب کو بتایا کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ کی خواہش ہے کہ آپ نورالایضاح کا حاشیہ لکھدیں، اس وقت تک نورالایضاح کا کوئی حاشیہ موجود نہیں تھا۔ اور مدارس کے طلباء واساتذہ کو نورالایضاح کے پڑھنے پڑھانے میں، اکثر دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

بہرحال مولانا عثمانی مرحوم کے حکم پر نورالایضاح کا حاشیہ سب سے پہلے لکھا گیا۔ یہ حاشیہ پہلے، پہلے فارسی میں لکھا گیا تھا، اس کے بعد اسی کتاب کا دوسرا حاشیہ عربی میں مولانا نے تحریر کیا۔ مولانا کے یہ دونوں حاشیے بے حد مقبول ہوئے اور علماء وطلباء دونوں جماعتوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھے گئے،

پہلا اڈیشن "مطبع قاسمی" سے اور دوسرا اڈیشن "کتب خانہ انصاریہ" سے شائع ہوا۔

حاشیہ حماسہ

نور الایضاح کے تحشیہ کے دوران میں مولانا کو ادب کی مشہور کتاب "حماسہ" کے تحشیہ کا خیال ہوا اور مولانا عثمانی مرحوم کی ہمت افزائی پر مختصر سی مدت میں حاشیہ مکمل کر دیا گیا،

حماسہ کے حاشیہ کے تین اڈیشن اب تک شائع ہو چکے ہیں، پہلا اور دوسرا اڈیشن "مطبع قاسمی" سے اور تیسرا اڈیشن "کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہوا۔ دیوان حماسہ فصحائے عرب قدیم کے اشعار کا ایک ایسا مجموعہ ہے کہ جس کی رفعت و عظمت کا اعتراف دنیا کے ہر اس گوشہ میں کیا جاتا ہے، جہاں عربی ادب کا ادنیٰ سے ادنیٰ ذوق موجود ہے، لہٰذا ایسی نادرہ روزگار کتاب کا حاشیہ بھی اسی کو زیبا ہے جس کی عمر کا ایک طویل حصہ ادب عربی ہی کی خدمت میں گذر گیا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا کا یہ حاشیہ اور متنبی کا حاشیہ ادب کے دلدادہ جماعت میں بے حد پسند کیا گیا۔

حاشیہ کنز الدقائق

فقہ کا یہ مشہور و معروف متن جس کی شرح میں علامہ ابن نجیم کو آٹھ ضخیم جلدیں لکھنا پڑیں۔ مولانا نے اس کا مختصر اور اتنا مفید حاشیہ لکھدیا کہ اب ابن نجیم کی طویل شرح سے علماء اور طلباء بے نیاز ہو گئے، حاشیہ پر صورت مسئلہ، مختلف فیہ اقوال مذہب حنفیہ کی ترجیحی وجوہات، مشکل مقامات کی تصحیح اور سہل تفسیر اختصار کے ساتھ سب ہی کچھ آ گیا، کنز کے حاشیہ کا پہلا اڈیشن "مطبع قاسمی" سے اور دوسرا

اڈیشن مکتبہ خانہ رحیمیہ دیوبند سے شائع ہوا، اور مولانا کے دیگر حواشی کی طرح یہ حاشیہ بھی مقبول عام ہوا۔

حاشیہ متنبی۔

نظم عربی کی یہ مشہور اور معروف کتاب کس درجہ مشکل اور سخت ہے اس سے ہر اہل علم واقف ہے، ضرورت تھی کہ ادب عربی کے اس شاہکار کا کوئی عام فہم اور سہل حاشیہ لکھا جائے، حضرت مولانا نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک نہایت مفید حاشیہ لکھکر متنبی ایسی کتاب کو حد درجہ سہل لماخذ و آسان بنادیا مولانا کے اس حاشیہ کی چند خصوصیات ہیں۔

(۱) سب سے پہلی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ سالہا سال کے تعلیمی تجربہ میں مولانا ممدوح کو طلبا اور مدرسین کے لئے جن امور کی وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی ان سب کو اس حاشیہ میں درج فرمادیا۔

(۲) تعلیقات عربیہ کو مکمل طرح سے واضح کردیا ہے،

(۳) مواضع مختلفہ میں ایک ایک شعر کی متعدد توجیہات، شگفتہ زبان اور ادیبانہ طرز بیان میں کی گئیں کہ جنھیں عقل کسی نکیر کے بغیر تسلیم کرلیتی ہے۔

(۴) جو خصوصی تحقیقات اور مطالب شعریہ اپنے باعظمت اساتذہ اور صاحب کمال ادباء سے ان تک پہنچیں تھیں ان کو بڑی فیاضی کے ساتھ عام استفادہ کے لئے حاشیہ میں لکھدیا ہے۔

یہ حاشیہ بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھا گیا، اور آج عربی مدارس کے علاوہ یونیورسٹی کے طلبا بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں، اور ان حلقوں میں مولانا کی

شہرت اور ان کا تعارف اس حاشیہ اور حماسہ کے حاشیہ کی وجہ سے پہنچا ہے۔

حاشیہ شرح نقایہ

شرح نقایہ دو ہیں ایک ملا علی قاری کی اور دوسری شمنی کی، مؤخر الذکر نسخہ قلمی دارالعلوم دیو بند کے عظیم الشان کتب خانہ میں موجود ہے، اول الذکر قازان میں طبع ہوا اور جب ہندوستان میں شائع ہوا تو اس کو قازان ہی کے مطبوعہ نسخہ سے نقل کیا گیا۔ قازان کے مطبوعہ نسخہ میں اغلاط کثرت کے ساتھ موجود تھیں اس وجہ سے ہندوستان میں شائع شدہ نسخہ میں بھی یہ اغلاط منتقل ہوئیں۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب ان کے علوم کا طغرائے امتیاز ہے، حضرت امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری مرحوم جو قاری رحمۃ اللہ علیہ کے علم وفضل پر زیادہ اعتماد نہیں کرتے تھے اور قاری کی مشہور کتاب "مرقاۃ شرح مشکوٰۃ" پر ہمیشہ حضرت شاہ عبدالحق محدث رحمۃ اللہ علیہ کی لمعات اور اشعۃ اللمعات کو ترجیح دیتے، اس کتاب یعنی نقایہ کے بے حد مداح تھے، اور اکثر فرماتے کہ

"قاری نے اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا"

حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب نے یہ حاشیہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی تحریک پر اس وقت لکھا تھا جب حضرت شاہ صاحب مرحوم نے شرح نقایہ کو شرح وقایہ کی جگہ داخل درس کرانے کی کوشش فرمائی تھی، حضرت مولانا نے حاشیہ کے ساتھ ہندوستان میں شائع شدہ نسخہ کی اغلاط کی بھی اصلاح فرمائی۔ مولانا کا یہ حاشیہ مکتبہ خانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہوا۔

نفحۃ العرب۔

حضرت مولانا کی مشہور و معروف تالیف جس نے جدید تالیفات میں اپنے لئے
ایک خاص مقام پیدا کرلیا ہے اور دنیائے ادب میں اس تالیف کو پسندیدگی اور
قدر کی نظروں سے دیکھا گیا فنِ ادب کی یہ ایک جامع کتاب ہے جس میں مؤلف
ممدوح نے کوشش کی ہے کہ اس کے ذریعہ سے طلباء میں اسلامی غیرت و حمیت،
ادبی دلچسپی، علو ہمت اور علوم عربیہ کی قوت و استعداد پیدا کی جائے۔ نیز
مسائل مبہم کی تسہیل، اخلاق فاضلہ کی تکمیل کے ساتھ مضامین ایسے شگفتہ اور
جاذب ہوں کہ اُن کو محنت کے ساتھ یاد کرنے میں طلباء کے اذہان کو نہ تعب ہو اور
نہ تشویش۔ حضرت مولانا کی یہ تالیف دارالعلوم کے علاوہ اکثر عربی مدارس
میں داخلِ نصاب ہے۔ طلباء کی ادب عربی کی استعداد کو جس قدر جلا
اس کتاب نے پہونچایا آج تک کسی اور کتاب نے نہیں پہونچایا تھا یہی وجہ
ہے کہ اکابر علماء نے بھی اس تالیف کو بے حد پسند فرمایا۔ حکیم الامت حضرت
تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں حضرت مولانا اعزاز علی
صاحب کو تحریر فرمایا تھا ؎

"ز دستِ کوتۂ خود زیر بارم
کہ از بالا بلنداں شرمسارم"

"ایک شرمساری تو کتاب کی رسید عرض نہ کرنے کی، دوسری شرمساری
علمی سرمایہ کی کمی سے اس کی مدح سے قاصر رہنے کی۔ اس میں کسی
قدر ضعف ہمت کا بھی ہے۔ اجمالاً اتنا عرض کرنے کی جسارت

کرتا ہوں کہ اپنی شانِ خاص میں دوسرے منتخبات سے ممتاز ہے۔ اگر
میں درس و تدریس سے قاصر نہ ہوتا تو اپنے متعلقین کو ضرور پڑھاتا
باوجود فقدانِ ہمت کے آنے کے وقت سے ایک معتدبہ وقت تک
میری میز کی پر رکھی رہی۔ ذرا وقت ملتا تھا تو اس سے مستفید ہوتا۔"
اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کی رائے مولانا
کی تالیف " نفحۃ العرب " کے متعلق یہ تھی:۔

" ادب عربی کے ابتدائی اور متوسط درجہ کے لئے آج تک
کوئی ایسی کتاب موجود نہ تھی جس میں ادبی محاسن کے ساتھ
ساتھ اخلاقی، اصلاحی اور تاریخی حیثیت کا بھی لحاظ رکھا گیا
ہو۔ اس کتاب میں ان مواد کے جمع کرنے میں مؤلف نے اپنے حسن
حُسنِ انتخاب کا ثبوت دیا ہے وہ ادبی نصاب کی عام کوتاہیوں
کے مقابلہ میں قابلِ صد تحسین و تہنیت ہے۔ سیرتِ نبویہ علیہ التحیۃ
والتسلیم، سیرتِ صحابۂ کرام، عشرۂ مبشرہ وغیرہا کے مبارک
عنوانات، ادبی قابلیت، پیدا کرنے کے ساتھ پاکیزہ اخلاق، بلند
معیار خصائل اور اسلامی، مذہبی جذبات کے داعی و محرک ہیں۔ میرے
نزدیک ہندوستان کے کسی اسلامی و عربی مدرسہ کا اس کے درس سے
خالی رہنا ایک مفید شئے سے محروم رہنا ہے اور اُس کے تعلیمی نصاب
میں کوتاہی کی دلیل ہے۔

غرضیکہ عربی ادب کا یہ بہترین گلدستہ اور ادیب وقت کے حسنِ انتخاب کا بہترین نمونہ

بے حد مقبول ہوا اور اس کے کئی ایڈیشن اب تک کتب خانہ اعزازیہ دیوبند سے شائع ہو چکے۔

حضرت مولانا نے خود ہی اس پر حاشیہ تحریر فرمایا۔ اور "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" اگر مشہور مقولہ صحیح ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ ایسا حاشیہ تحریر کرنا کسی اور کی مقدرت میں نہیں تھا۔

مولانا نے اب اپنی کبرسنی اور کثیر المشاغل ہونے کے باوجود، مولانا فخر الحسن صاحب استاذ دار العلوم کی فرمائش پر عربی ادب کی ابتدائی کتاب "مفید الطالبین" پر حاشیہ لکھا ہے۔ مولانا اس سے پہلے بھی اس کتاب پر حاشیہ لکھ چکے تھے لیکن وہ مختصر تھا۔ اُمید ہے کہ مولانا محترم کا یہ جدید حاشیہ عربی مدارس کے مبتدی طلبا کے لئے بڑا مفید ثابت ہوگا۔

ان تعلیقات و تالیفات کے علاوہ حضرت مولانا کی تصانیف و حواشی اور بھی ہیں اور حضرت مولانا نے درس نظامی کے علاوہ عربی کی نادر کتابوں کے حاشیے لکھے ہیں۔ ان سب کی تفصیل طوالت کا باعث ہوتی۔ اس لئے خاکسار نے اختصار سے کام لیتے ہوئے ان کی تعلیقات و تالیفات کی یہ مختصر سی فہرست پیش کی ہے۔ ہاں ایک بات یاد آئی اور وہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

حضرت مولانا نے اپنے ان تمام حواشی اور تالیفات پر کسی قسم کا معاوضہ یا حق الخدمت لینا گوارا نہیں کیا۔ حالانکہ مولانا کی معیشت آسودہ حالی سے بہت دور ہے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنی اُن تالیفات پر جو علمی حلقوں میں بے حد مقبول ہوئیں، زر و نقد کا انبار لگا لیتے۔ لیکن اُنھوں نے ایسا نہیں کیا اور بڑی فیاضی کے ساتھ

اپنی ان علمی کاوشوں کو شائع کرنے والے کتب خانوں کے سپرد کر دیا ہے۔
آج دیوبند کا کچھ کتب خانے مولانا کی ان مقبول تالیفات کی وجہ سے ایک بڑے سرمایہ کے مالک بن گئے ہیں۔ موجودہ دور میں مولانا کا یہ بڑا ایثار ہے جس کی مثال مشکل سے ملیگی۔ حضرت مولانا کی تصانیف و تالیفات کے مختصر سے ذکر کے بعد مجھے یہ بتانا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی زندگی کو ایک مثالی زندگی بنا لینے اور اپنے اوقات کو علمی مشاغل میں صرف کرنے میں کن کن شخصیتوں سے استفادہ کیا اور آج مولانا کو جو امتیازی شان حاصل ہے اُس میں اُن کی اپنی جد و جہد کے علاوہ کن محترم ہستیوں کی توجہ و کرم کو دخل ہے۔
یوں تو حضرت مولانا نے دارالعلوم دیوبند کے اکثر اکابر مثلاً حضرت مولانا عزیز الرحمٰن صاحب مرحوم۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کافی استفادہ کیا۔ لیکن اس سلسلہ میں خود مولانا ایک ذاتِ گرامی کو ہمیشہ سب سے اولیٰ رکھتے ہیں۔ یہ ذاتِ گرامی حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے اسلئے ہم بھی اس داستان کو ذرا سی تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔

امام العصر مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری سے طویل استفادہ۔

حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ علم کے اس بحر ذخار اور فضل و کمال کے دریائے ناپیدا کنار کا ذکر اور شہرت اپنی تبحر علمی، بے نظیر قوتِ حافظہ، ممتاز ذکاوت و ذہانت، اور اس وجہ سے کہ انکی دستارِ علم میں علمی فضائل کے دُرہائے شہوار آویزاں تھے ہند و پاکستان کی حدود سے گذر کر ممالک اسلامیہ کے گوشہ گوشہ میں پہنچی۔ حضرت شاہ صاحب مرحوم

ایسے وسیع النظر عالم اور بحر العلوم سے اگر دینی مدارس و مکاتب متأثر ہوئے تو دوسری جانب آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں سے نکلنے والیں نئی تعلیمیافتہ شخصیتیں بھی اُن کی تبحر علمی کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکیں۔ تنوع علمی جس انداز سے اُن کی ذات میں جمع ہوگئی تھی اُس کی مثال بہت کم ملے گی۔ اپنا تو یہ خیال ہے کہ ایسی جامع شخصیتوں کے پیدا کرنے میں خود قدرت بھی زیادہ فیاضی سے کام نہیں لیتی۔ صدیوں کے بعد ایسے فاضل روزگار اور امام عصر پیدا کئے جاتے ہیں۔ اُن کے تلامذہ کا بڑا طویل و دراز سلسلہ ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج ہندوستان میں زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ اس کا تعلق دین سے ہو یا سیاست سے، قومی مسائل سے ہو یا مذہبی معاملات سے۔ اُن کے مکتب خیال میں تربیت پائے ہوئے پیش پیش نظر آتے ہیں۔

بہرحال حضرت الاستاذ مولانا محمد اعزاز علی صاحب کو اس نادرۂ روزگار شخصیت سے استفادہ کا طویل موقعہ ملا۔ اور غالباً مولانا کی ذات واحد شخصیت ہے کہ جس کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اتنا کافی وقت فیضیاب ہونے کا میسر ہوا ہو۔ مولانا نے اس طویل مدت میں ہر چھوٹی بڑی درسی، غیر درسی کتب شاہ صاحب قدس سرہٗ سے سبقاً سبقاً بھی پڑھی۔ اور نوادرات علمی کا اُن کی نگرانی میں کاوش کے ساتھ مطالعہ کیا۔ حضرت مولانا نے خاکسار سے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں جس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں ابتدائی مدرس مقرر ہوکر آیا تو کتب میں اگر کبھی کوئی اشکال پیش آتا تو مولانا سہول صاحب بھاگلپوری سے مراجعت کرتا لیکن ابھی مجکو دارالعلوم میں مدرس ہوئے تھوڑا سا

وقت ہی گذرا تھا کہ مولانا بھاگلپوری یہاں سے علیحدہ ہوکر بہار یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوکر تشریف لیگئے۔

مجکو اُس وقت اس سلسلہ میں واقعی تشویش تھی کہ اُستاذ محترم مولانا بھاگلپوری کی طرح اب کون میرے ساتھ اس قدر شفقت سے محنت کریگا۔ میں اسی تردد و خلجان میں تھا کہ مولانا سہول صاحب نے روانہ ہونے سے کچھ قبل مجھ سے فرمایا کہ میں نے حضرت شاہ صاحب سے تمہارے متعلق کہدیا ہے اگر کبھی ضرورت محسوس ہو تو بلا تامل حضرت شاہ صاحب سے رجوع کرنا۔
مولانا کی حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق کی ابتدا اس طرح سے ہوئی۔ پھر یہ مولانا کی طلب علم تھی کہ انہوں نے پھر اس سلسلہ میں کسی قسم کا کوئی تکلف نہیں کیا وہ ایک عام طالب علم کی طرح بغل میں کتاب دبائے ہوئے حضرت شاہ صاحب کی جائے قیام پر اس کے منتظر نظر آتے کہ اجازت ہو اور وہ پہونچ جائیں۔ مولانا کے لئے نہ وقت کی تعیین تھی نہ تحدید۔ وہ جسوقت چاہتے پہونچ جاتے اور جتنا چاہتے استفادہ کرتے۔

خود حضرت مولانا نے مجھ سے بارہا فرمایا کہ میں حاضر ہوکر شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اگر ایک بات پوچھتا تو وہ اپنے غایت الطف و کرم سے کام لیتے ہوئے سینکڑوں ایسی علمی باتیں ایک ہی مجلس میں بتا دیتے کہ اگر مطالعہ کرکے اُن کو حاصل کیا جائے تو بلا مبالغہ ہزارہا صفحات والی ضخیم کتابیں مدتوں تک اُلٹ پھیر کرتے رہیں تو اُن نوادرات کا پتہ نہ چلے۔ ایسی نوادرات علمی کہ عوام سے گذر کر خواص علماء میں بھی جن کا علم دو چار ہی کو ہے مجکو بتاتے۔ اُن کا مطالعہ کراتے دوران

مطالعہ میں اگر اشکالات پیش آتے تو اُن کو حل فرماتے۔ اگر ایک جانب مولٰنا اعزاز علی صاحب دریائے علم کے اُس کامیاب شناور کے تبحر علمی، جلالتِ شان، کمال اور امامت کو دیکھکر گرویدہ ہوگئے تو دوسری طرف خود حضرت امام العصر مولانا اعزاز علی صاحب کے شوقِ علم، ذوقِ جستجو کو پاکر کچھ ایسے متاثر ہوئے کہ اپنے اُن گرانمایہ اوقات سے جن میں سے خاص متعلقین کے لئے ایک لمحہ کا صرفہ اُنہیں پسند نہ تھا، مولانا کے لئے ان اوقات کا ایک معتدبہ حصہ کے فیاضی کرنے میں بھی دریغ نہ کیا جاتا۔ اور پھر صرف یہی نہیں بلکہ ہر حیثیت سے اس کی کوشش کی گئی کہ مولانا اعزاز علی صاحب کو ہندوستان کے منتخب علماء میں سے جلد شمار کرا دیا جائے۔

حضرت مولانا نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ مجلسِ علمیہ میں سالِ رواں کے لئے اساتذہ کو اسباق دیئے جا رہے تھے۔ حضرت شاہ صاحب جو اس مجلس کے رکن تھے اُنہوں نے تجویز پیش کی کہ اس سال "ابن ماجہ" تدریس کے لئے مولٰنا اعزاز علی صاحب کو دیا جائے۔ مجلس نے حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی اس تحریک پر ابن ماجہ مجھکو دیدیا۔ میں نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمرہ پر پہنچکر ابن ماجہ کی تدریس سے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا کہ صحاح ستہ کی کسی کتاب کو میں نہ پڑھا سکوں گا۔ میری اس گذارش پر شاہ صاحب اُٹھے اور کمرہ کے ایک گوشہ سے ابن ماجہ کا ایک نسخہ اُٹھا لائے۔ اُس نسخہ پر حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حاشیہ بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا ہوا تھا۔ میری جانب بڑھاتے ہوئے فرمایا کہ مولوی صاحب لیجئے، اِسکو دیکھئے اور پڑھائیے۔ انشاء اللہ اب کوئی دشواری

آپ کو پیش نہ آئیگی۔" غرضیکہ اس طرح مولانا کی ہمت افزائی اور اُن کی علمی زندگی کو کامیاب بنانے کے لئے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے اس قسم کے معاملات اکثر پیش آتے رہتے تھے۔

خود حضرت مولانا نے بارہا اظہار فرمایا اور وہ اپنی تحریروں میں بھی اس کا اعتراف کرتے رہے ہیں کہ میری موجودہ علمی زندگی کی یہ حسین عمارت اور اس کا یہ رنگ و روغن تمام کا تمام حضرت شاہ صاحب کی دُکانِ علم سے ملا ہوا ہے۔

اور پھر اس استفادہ و افادہ میں نہ اختلاف رائے حائل ہوا اور نہ وقتی مسائل میں مسلک کا بعد ایک کو دوسرے سے بعید کرسکا۔ دار العلوم کی مشہور "اصلاحی تحریک" کے زمانہ میں باہر سے ایک صاحب صرف اس لئے آئے کہ مولانا اعزاز علی صاحب سے "مسلم شریف" پڑھیں گے۔ اختلافات کے عین شباب میں مولانا موصوف نے حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اُنکے مکان پر جاکر مسلم کا مقدمہ سبقاً سبقاً پڑھا۔ حضرت الاستاذ کو امام العصر مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیقات آج بھی اس طرح سے محفوظ ہیں کہ وہ اپنے حواشی میں، تالیفات میں، درس میں کثرت سے بیان کرتے رہتے ہیں۔

خاکسار نے حضرت مولانا کو شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر جس عظمت اور عقیدت سے کرتے ہوئے دیکھا اُس کی مثال مولانا کے یہاں دیگر اساتذہ کے ذکر و بیان میں نہیں پائی۔ حضرت مولانا اس قوی اور نہایت مخلصانہ تعلق کی آج تک رعایت فرماتے ہیں۔ خاکسار کے ساتھ مولانا کی تمام عنایتوں اور شفقتوں کا قوی منشاء اور باعث، حضرت شاہ صاحب کی ذات گرامی سے والہانہ تعلق کا

نتیجہ ہے۔ مولانا نے حضرت امام العصر سے جو طویل استفادہ فرمایا ہے اُس کی تفصیل خود ایک کتاب کی صورت میں پیش کی جا سکتی۔ یہ چند صفحات کی کتاب اس تمام تفصیل کی کیسے متحمل ہو سکتی تھی۔ اس لئے مختصر طور پر چند باتیں عرض کر دی گئیں کہ حضرت شیخ الادب کی علمی زندگی کا یہ بھی ایک نہایت اہم باب تھا۔

حضرت شیخ الادب کے مشہور تلامذہ۔

خاکسار پہلے عرض کر چکا ہے کہ مولانا کے تلامذہ کی تعداد پانچ چھ ہزار سے کم نہ ہوگی۔ امام العصر حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کشمیری اور حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی کے اکثر تلامذہ حضرت مولانا سے بلاواسطہ استفادہ کرنے والے ہیں۔ مولانا ممدوح کے اکثر شاگرد ذی علم و صاحب لیاقت ہیں۔ ہند و پاکستان کے اکثر مدارس میں مولانا کے تلامذہ کام کر رہے ہیں۔ احقر کا خیال ہے کہ اگر مولانا کے بلاواسطہ شاگردوں کے ساتھ بالواسطہ تلامذہ کو بھی شمار کر لیا جائے تو دیوبندی جماعت میں تلامذہ کا اس قدر وسیع حلقہ کسی اور کا نظر نہیں آتا۔ اُن سب کی تفصیل پیش کرنا ظاہر ہے کہ ناممکن ہے۔ تاہم مولانا کے چند مخصوص اور ممتاز شاگردوں کے نام ذیل میں پیش کرتا ہوں۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا کے دامن تربیت و درسگاہ فیض سے کیسے کیسے کامل اور فاضل اُٹھے ہیں۔ اور معلوم ہے کہ لائق و قابل تلامذہ اپنے اُستاذ کے علم و فضل پر ایک قوی حجت اور مضبوط دلیل ہوتے ہیں۔ مولانا کے مشہور تلامذہ یہ ہیں:-

مولانا حفظ الرحمن صاحب سیوہاروی۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی۔

مولانا عتیق الرحمن صاحب عثمانی۔ مولانا محمد میاں صاحب۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب کاکوروی۔ مولانا مفتی محمود صاحب نانوتوی۔ مولانا منظور احمد صاحب نعمانی۔ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی۔ مولانا نسیم احمد صاحب فریدی۔ قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی۔ مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ مولانا فخر الحسن صاحب مدرس دارالعلوم۔ مولانا محمد جلیل صاحب مدرس دار العلوم۔ مولانا معراج الحق صاحب۔ مولانا عبدالاحد صاحب اور مولوی سید حسن صاحب۔

حضرت الاستاذ کی جامع شخصیت گوناگون خصوصیات سے بہرہ ور رہی ہیں علم و فضل اور مختلف کمالات کے جہاں سینکڑوں گوہر نایاب پائے جاتے ہیں، وہیں شاعری اور انشاپردازی کے لعل بے بہا بھی اُن کی دستار فضیلت میں آویزاں ہیں۔ اُن کی شاعری اور انشاء پردازی آجکل کی رائج الوقت عام شاعری اور انشاء پردازی کی طرح، الفاظ کی بھرمار، معنویت سے خالی اور صرف سطحیت پر پھیلی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی شاعری و انشاپردازی سے علم و کمال کی بو آتی ہے۔ دانش و فضل کی جھلک سے معطر اشعار، مضامین علمیہ سے لبریز تحریریں۔ فضل و ہنر کا غالب پہلو لئے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُنکی تحریروں سے علمی حلقوں نے فائدہ اُٹھایا۔ اور علماء کے حلقہ میں اُن کی انشاء پسندیدہ نظروں سے دیکھی گئی۔ خاکسار مولانا کی شاعری اور انشاء پردازی پر مستقل عنوان کے ساتھ مختصر سا ذکر کرنا چاہتا ہے۔

مضمون نگاری۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مولانا نے اپنا سب سے پہلا مضمون،

میرٹھ مدرسہ قومی کے جلسۂ دستار بندی میں پیش کیا تھا جس کو حاضرین نے بے حد پسند کیا۔ مولانا کے اسی "مقالۂ علمی" سے خود مولانا اور دوسروں کو پہلی دفعہ یہ احساس ہوا کہ مولانا میں انشاء پردازی کی بھی اچھی صلاحیت موجود ہے۔ چنانچہ میرٹھ جلسہ کے بعد مولانا نے کثرت سے مضامین لکھے۔

پوریتی مدرسہ نعمانیہ کی مدرسی کے زمانہ میں اُن کا یہ مذاق بعض ادبی اور علمی صحبتوں کے میسر آنے کی وجہ سے ترقی کی طرف بڑھا اور نکھر گیا اور اب اُن کی تحریروں میں شستگی اور شگفتگی کے ساتھ وقتی رجحانات کی بھی اچھی ترجمانی پائی جانے لگی۔

اسی دوران میں مولانا دار العلوم دیوبند میں مدرس ہو کر آئے تو اُس وقت دارالعلوم سے "القاسم" و "الرشید" مشہور علمی رسالے ماہ بماہ شائع ہو رہے تھے۔ غالباً "القاسم" میں ایک خاص عنوان مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی اس خیال سے لکھتے کہ وہی دارالعلوم کی ایک مستقل اور معتبر تاریخ بن جائے۔ مولانا عثمانی کا یہ مضمون ہر ماہ شائع ہوتا اور دارالعلوم سے تعلق رکھنے والے حلقوں میں خاص طور پر پسند کیا جاتا۔ لیکن اسی دوران میں مولانا عثمانی کی طبیعت کچھ ناساز ہوئی اور علالت کی وجہ سے اُن کو اس مفید اور دلچسپ سلسلۂ مضامین کے بند کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ مولانا مرحوم کے اس اعلان پر ہر جانب سے خطوط پہونچنے لگے جن میں اس سلسلہ کو باقی رکھنے کی پُرزور گذارش اور درخواست کی گئی تھیں۔ احباب و متعلقین کے اس شدید اصرار کا مولانا مرحوم اپنی ایک مجلس میں ذکر کر رہے تھے اور اس کے ساتھ اپنی طویل علالت کی بناء پر ان مطالبہ کی

عدم تعمیل کا افسوس بھی زبان پر تھا۔ مجلس میں حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب بھی موجود تھے۔ مولانا نے اپنی جائے قیام پر واپس آنے کے بعد مولانا عثمانی کے اُس خاص عنوان پر قلم اُٹھایا اور چند گھنٹوں کی محنت سے ایسا مضمون تیار کر دیا کہ اچھے اچھے ارباب تمیز وشعور بھی یہ تمیز نہ کر سکے کہ یہ مضمون مولانا عثمانی کے قلم سے نکلا ہوا ہے یا کسی اور کی قلمکاری کا نمونہ ہے۔ رسالہ میں مضمون شائع ہوا اور مولانا عثمانی کی جانب سے حضرت الاستاذ کو حکم ہوا کہ اب آیندہ اس عنوان پر تم ہی لکھا کرو۔ اس کے بعد مولانا انشاء پردازی میں ایسے مشہور ہوئے کہ "القاسم" و "الرشید" کی ادارت مولانا کے سپرد کی گئی۔ اور اپنے وقت میں ہندوستان کے ان مشہور رسالوں کی ادارت کے فرائض مولانا نے بخوبی انجام دئے۔

یہی وقت تھا کہ القاسم وغیرہ میں مولانا عثمانی مرحوم کا مشہور مضمون "دُنیا میں اسلام کیونکر پھیلا" شائع ہو رہا تھا۔ یہ مضمون ملک کے تمام حلقوں میں بے حد پسند کیا جا رہا تھا۔ بلکہ بعض ناشرین نے اس کی مقبولیت کو دیکھکر مضمون کا جتنا حصہ شائع ہو چکا تھا اُسی حصہ کو کتابی شکل میں بھی شائع کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ مولانا عثمانی مرحوم اور دوسرے اکابر کی موجودگی میں مولٰنا اعزاز علی صاحب نے مولانا عثمانی سے فرمایا کہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی سامنے آنا چاہیئے۔ اور اب اس کے ساتھ کہ دُنیا میں اسلام کیونکر اشاعت پذیر ہوا اسکے بھی بتانے کی ضرورت ہے کہ دُنیا کو اسلام سے کس کس طرح روکا گیا اور مخالفانہ طاقتوں نے اسلام کی اشاعت کو کن کن راہوں سے روکنے کی سخت جدوجہد کی۔ ہر شخص نے مولانا سے کہا کہ اس موضوع پر واقعی لکھنے کی ضرورت ہے اور اسکی

اہمیت آپ ہی سے لکھنے کا تقاضہ کرتی ہے۔ مولانا نے اس شدید اصرار پر مجبور ہوکر عام رائے معلوم کرنے کے لئے چند سطور رسالہ میں تحریر فرمائیں تو ہر طرف سے اس مضمون کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے مقالہ کو رسالہ میں شائع کرنے کا مطالبہ کیا گیا بلکہ ایک صاحب نے اعلان کیا کہ مولانا جب تک اس موضوع پر لکھیں گے ایک معقول رقم وظیفہ کے طور پر اُن کی خدمت میں پیش کیجاتی رہیگی۔ اس علم دوست، فضل پرور انسان کی اس پیشکش کو مولانا نے کمال استغناء کے ساتھ واپس کردیا اور اپنے مضمون کی رسالہ میں اشاعت شروع کرادی۔ ابھی ایک دو ہی قسطیں شائع ہونے پائی تھیں کہ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "اعزاز العلماء" کے معزز خطاب سے سرفراز فرمایا۔

مولانا کا یہ طویل مضمون القاسم وغیرہ کے علاوہ الفرقان لکھنؤ اور رسالہ دارالعلوم دیوبند میں پچھلے دنوں شائع ہوتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا ہندوستان کے اکثر علمی رسالوں میں لکھتے رہے ہیں اور مولانا کی تحریریں عام طور پر پسند کیجاتی رہیں۔ تاریخ دیوبند کے مصنّف "سیّد محبوب صاحب رضوی" نے ایک مجلس میں خاکسار سے کہا تھا کہ :-

"علمائے دیوبند میں مولانا اعزاز علی صاحب کو انشاء پرداز کی حیثیت سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے مضامین میں وقتی رجحانات اور موجودہ انشاء پردازی کا رنگ کافی حد تک موجود ہے۔"

ارباب نظر محبوب صاحب کی اس رائے کی تائید کرینگے۔

شاعری

عالمِ اسلامی کے عام علماء و فضلاء کو چھوڑ کر کہ ان میں بعض بزرگ ایسے شاعری میں وہ ملکۂ راسخہ رکھتے تھے جسکی مثال اُن شعراء میں بھی نہیں پائی جاسکتی جنکا نام ہی شعراء کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ خود دارالعلوم کے اساتذہ اور اکابر میں اگر یہ کہا جائے کہ جماعت کے اکثر و بیشتر افراد شاعری کے اچھے خاصے مذاق سے بہرہ ور رہے ہیں تو اس میں نہ مبالغہ آرائی ہوگی اور نہ خلاف واقعہ حکایت۔ سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے لیکر آج تک کے علمائے عربی و فارسی اور اُردو میں صاف، ستھرا بلکہ نکھرا ہوا کلام پیش کرتے رہے ہیں۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی، جو اپنے وقت کے بڑے ادیب، عربی شاعری کے دلدادہ اور اسکے رمز شناس ہونے کے علاوہ خود ایک منجھے ہوئے شاعر تھے وہ اکثر امام العصر حضرت العلامہ مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی عربی شاعری سُنتے تو سر دُھنتے۔ اور بار بار فرماتے کہ شاہ صاحب کے کلام سے مجکو عرب جاہلیت کی شاعری کی بو آتی ہے۔ اور خود دیوبندی حلقوں سے باہر بھی علمائے دیوبند کے اس خاص رنگ کو پسند بھی کیا گیا۔ اور اس کی تقلید بھی کی گئی۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ اسی جماعت کے ایک ممتاز رکن حضرت الاستاذ مولانا اعزاز علی صاحب بھی ہیں اور اس وقت خاکسار مولانا ممدوح ہی کی شاعری پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہے۔

مولانا کی شاعری کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک اُردو شاعری اور دوسری عربی شاعری۔ مولانا نے فارسی میں کبھی طبع آزمائی نہیں فرمائی۔ حالانکہ

فارسی کا ذوق بھی مولانا کو عربی سے کم نہیں۔ عربی میں مولانا نے اُس وقت سے کہنا شروع کیا جب وہ دیوبند سے فارغ ہو چکے تھے۔ لیکن اُردو میں وہ نہایت کم سنی اور خرد سالگی سے کہتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے ساتھ مولانا کی اُردو شاعری کی داستان اور اس کے مختلف ادوار کی تاریخ دلچسپ بھی ہے اس لئے پہلے اُردو شاعری کا ذکر کرتا ہوں۔

اردو شاعری۔

گذشتہ صفحات سے یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ مولانا نے ایک ایسے ماحول میں نشو و نما پایا تھا جس میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا اور اس ماحول پر ادبیت کا رنگ کافی حد تک غالب تھا۔ مولانا نے آنکھ کھول کر دیکھا تو اپنے قریب شعر کہنے والے، شاعری سے مذاق رکھنے والے لوگوں کا ہجوم پایا۔ کچھ ہوش و آگہی کی زندگی کا آغاز ہوا تو مجلس مقابلہ و مناشدت کے ہنگامہ خیزیوں نے مولانا کی شاعرانہ طبیعت و فطرت کو مہمیز لگائی۔ اور انجام کار ان ہی مجلسوں کی شرکت، سرگرمیاں، مولانا کی شاعری کی ابتدائی سنگِ بُنیاد بنیں۔

جس زمانہ میں مولانا اپنے والد کے ساتھ "تلہر" مقیم تھے تو اُن کے رہائشی مکان کے قریب ایک صاحب مولوی نورالدین بدایونی رہتے تھے۔ یہ مولوی نورالدین صاحب تلہر کی عدالت میں وکالت کرتے تھے۔ مولانا کے والد صاحب کا مولوی صاحب موصوف سے بڑا گہرا تعلق تھا۔ اسی تعلق کی وجہ سے مولانا بھی اکثر مولوی نورالدین صاحب کے یہاں جانکلتے۔ مولوی بدایونی صاحب کو شاعری سے خاص شغف تھا۔ اور متقدمین اساتذہ کے ہزارہا منتخب اشعار نوک برزبان تھے۔

اُن صاحب کی مجلس میں مسلسل شرکت نے مولانا کی شاعرانہ طبیعت کے لئے نشو و نما کا ایک اچھا اور وسیع میدان پیدا کر دیا۔ لیکن گلشن فیض مدرسہ میں تعلیمی سلسلہ سے وابستگی کی بنا پر مشاعروں وغیرہ کی شرکت نہ ہو سکتی تھی۔ اس لئے مولانا کے شاعر ہونے کا علم چند احباب اور خاص لوگوں کے علاوہ بہت کم لوگوں کو تھا۔

گلشن فیض سے علیحدگی کے بعد مولانا خلیل الرحمٰن سے پڑھنا شروع کیا تو وہاں شعر کہنے سننے کے علاوہ کوئی اور مشغلہ ہی نہیں رہا۔ مولانا خلیل الرحمٰن صاحب جلالؔ لکھنوی کے مایۂ ناز شاگرد ہونے کے ساتھ کہنہ مشق اُستاذ بھی تھے۔ ان ہی صاحب کے بار بار اور مسلسل اصرار پر مولانا نے مشاعروں میں عام طور پر شرکت شروع کر دی۔ شعر گوئی، مشاعروں کی شرکت اسقدر آگے بڑھی کہ مولانا کا علمی شغل تقریباً ختم ہو گیا۔ مولانا کے بڑے بھائی مولوی وہاج علی صاحب اس صورت حال سے سخت پریشان تھے لیکن کوئی ایسی تدبیر سمجھ میں نہیں آتی تھی جس کے ذریعہ مولانا کے اس بڑھتے ہوئے مذاق کو روک سکیں۔ لیکن مبدأ فیاض کی فیض رسانیاں مولانا کو کسی اور ہی مسند پر لیجا کر بٹھانے والی تھیں اسلئے جب مولوی وہاج علی صاحب مجبور ہو کر بیٹھ رہے تو قدرت کے محض کرشمہ کاری اس طرح سے شروع ہوئی کہ مولانا نے اسی دوران میں ایک مشاعرہ میں شرکت کی۔ ہزارہا حاضرین کے علاوہ بہت سے مشہور شعراء بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ مولانا نے ایک مرصع غزل پڑھکر سنائی اس غزل کا مقطع تھا ؎

تیری نشیلی آنکھ نے بے خود بنا دیا
اعزازؔ ورنہ صاحب عقل و شعور تھا

شعر پڑھا گیا تو ہر طرف سے تحسین کی آوازیں بلند ہونے لگیں۔ مولانا کی کم سنی اور خُردسالگی کا عالم، یہ دیکھکر کہ شعر پسند اور مقبول ہوا بار بار اسی شعر کو دُہراتے غرضکہ تحسین و آفرین کے اِن ہی ہنگامہ خیزیوں میں واہ واہ کی دل خوش کن آوازوں میں حاضرینِ مشاعرہ میں سے ایک معمّر، سفید ریش، سفید پوش صاحب کی یہ آواز بھی مولانا کے کان تک پہونچی:۔

"طفلے کہ دم از عشق زند بس غنیمت است"

مولانا نے اسکو سُنا تو بے اختیار یہ آواز کچھ ایسی مؤثر ثابت ہوئی کہ مشاعروں کی شرکت سے مولانا کو سخت نفرت ہوگئی اور اب اس قسم کی مجالس میں شرکت سے مولانا پہلوتہی کرنے لگے۔ اِدھر بڑے بھائی نے مولانا کو متنبہ کرتے ہوئے آخری بار کہا کہ" اگر تم نے شعر و شاعری کا مشغلہ فوراً ختم نہ کیا تو تمہاری تمام کتابیں جلانے کے ساتھ عربی پڑھنے سے تمکو روک دیا جائیگا۔" کیونکہ مولانا نے عربی اپنے شوق و اشتیاق سے شروع کی تھی۔ اسلئے بڑے بھائی کی یہ تنبیہ اپنا کام کرگئی اور مولانا شاعری کو تو ختم نہ کرسکے لیکن مشاعروں کی شرکت سے اپنا دامن بچانے لگے۔ مولانا اب بھی اُردو میں اشعار کہتے ہیں۔ اور اُن کی اردو شاعری میں آمد، سلاست، روانی، شستگی، شگفتگی، برجستگی، غرضیکہ ایک اچھی شاعری کے سب ہی لوازمات پائے جاتے ہیں۔

یہاں پر یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ مولانا نے اردو شاعری میں اپنے محبوب اُستاذ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے اصلاح لی ہے۔ حضرت شیخ الہند برد اللہ مضجعہ، خصوصی تعلق کی وجہ سے مولانا ممدوح سے جو رعایت فرماتے

یہ اُسی کا نتیجہ ہے ورنہ حضرت مرحوم اپنے شاعر ہونے کا اظہار بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ خاکسار آیندہ صفحات میں مولانا کے اردو کلام کا مختصر انتخاب پیش کرتا ہے۔

(۱)

مانا کہ تا کتا بر افسق و فجور تھا — زلفوں کا دام تم کو بچھانا غرور تھا
افسوس ہے کہ "تو" کے بھی قابل نہیں رہا — جو آپکی زبان پہ کل تک "حضور" تھا
کسنے کہا کہ وادیٔ غربت میں تھے جُدا — دل سے بہت قریب تھا گو جسم دُور تھا
اُس دل میں حسرتوں کے سوا کچھ نہیں رہا — جو دل کہ تمکو دیکھ کے وقفِ سرور تھا
ہلچل زمیں پہ مچ گئی افلاک ہل گئے — یارب کسی کی آہ تھی یا نفخِ صور تھا
عفو اور صفح سے نہ لیا آپنے بھی کام — مانا کہ عشق آپ سے میرا قصور تھا

تیری نشیلی آنکھ نے بےخود بنا دیا
اعزاز ورنہ صاحبِ عقل و شعور تھا

(۲)

کچھ ہوش ہے اے ساقیِ فرزانہ کسی کا — لبریز ہوا جاتا ہے پیمانہ کسی کا
ہم آپ سے جاتے رہے سُنتے ہوئے جسکو — افسوں تھا الٰہی، کہ وہ افسانہ کسی کا

اعزاز ترا حال سُنا دے کوئی اُسکو
ہم دیکھتے ہیں۔ حوصلہ ایسا نہ کسی کا

(۳)

پہونچا جو میں بولے، کہ پھر آ گیا ظالم — دربان اسے کس لئے روکا نہیں کرتے
دل چھین لیا، جان کا بھی اب ہے ارادہ — بےکس کو تو یوں چور بھی لوٹا نہیں کرتے

(۴)

دل ہی نہیں وہ دل کہ تری جس میں جا نہیں
سر ہی نہیں وہ جس میں کہ سودا ترا نہیں

اے غیرتِ مسیح! تو اپنے مریض کو
جا دیکھ تو کہ اس میں کچھ اب ہے کہ کچھ بھی باہنیں

حسنِ بیاں میں نہیں اعزاز کا نظیر
آصف سا ملک میں کوئی فرماں روا نہیں

(۵)

ہر ایک رند نماز اُن کے پیچھے پڑھ لیتا
شیوخ وعظ اگر بادہ سے وضو کرتے

خطیب ہونے کا اپنے اُنہیں مزہ آتا
مشافہا جو کبھی مجھ سے گفتگو کرتے

دیارِ غیر میں گمنام ہو کے میں جو مروں
خدا کرے وہ پھریں میری جستجو کرتے

یہ دل کی دل میں تمنا رہی کہ وہ مجھکو
کبھی رقیب کی نظروں میں سرخرو کرتے

حریم کعبہ میں - میں چیخ چیخ کر رو دیا
ملائکہ رہے اعلانِ انصتوا کرتے

مقدرات سے مجبور ہو گیا ورنہ
مجال اُنکی تھی - وہ مجھ سے "تم" سے "تو" کرتے

(۶)

انقلابِ چمنِ دہر کی دیکھی تکمیل
آج قارون بھی کہہ دیتا ہے حاتم کو بخیل

بو حنیفہ کو کہے طفلِ دبستاں جاہل
مہرِ تاباں کو دکھانے لگی مشعل قندیل

شرک اسلام کو کہنے لگے اہلِ تثلیث
"لوحِ محفوظ" کو کہتی ہے محرّف انجیل

سامری موسیٰ عمراں کو کہے جادوگر
شیخ کی کرتے ہیں - اسکول کے بچے تجہیل

شیر اور بھیڑ کی یکجائی پہ حیرت کیوں ہو
ایک ہی کانٹے میں تلنے لگے موزون و ثقیل

صاحب فضل و علم نانِ جویں کے محتاج
ٹھوکریں کھاتے جو پھرتے تھے وہ لیتے ہیں خراج

بہار کے ایک دوست نے مولانا کو لکھ کر بھیجا کہ یہاں فلاں تاریخ کو ایک مشاعرہ ہے اس میں ہم بھی اشعار پڑھنا چاہتے ہیں۔ تم خود یا کسی صاحب سے کچھ اشعار لکھوا کر بھیجو۔ مولانا نے چند طلبا سے جو شعر کہتے تھے فرمائش کی لیکن کسی نے تعمیل نہ کی تو خود مولانا نے ارتجالاً یہ چند اشعار کہے۔

(۷)

ترے ہجر میں رہوں میں نوحہ زن۔ میں ہوں اور یہ شبِ تار ہے
جو انیس ہے تری یاد ہے۔ جو رفیق ہے دلِ زار ہے

کوئی سیرِ باغ میں مست ہے۔ کوئی ہے وطن میں بصد خوشی
مِرے دل کو چین ہو کس طرح۔ نہ بہار ہے نہ بہار ہے

صوبہ بہار

مرے پاس ہووے جو مال و زر۔ تو ہو خوف سارق و راہزن
مجھے بیش و کم سے غرض نہیں۔ نہ شراب ہے نہ خمار ہے

جہاں تھے حسینوں کے قہقہے۔ جہاں بلبلوں کے تھے چہچہے
نہ مکان ہے نہ مکین ہے۔ نہ وہاں رسن ہے۔ نہ دار ہے

وہ ہماری وضع بس تھی کشش۔ جو نماز میں بھی نہیں ہے اب
نہیں کچھ عجیب یہ رنگ ہے۔ وہ چڑھاؤ تھا یہ اتار ہے

اس کے علاوہ مولانا کا اُردو کلام مسدس، مخمس، اور مثنویات میں پھیلا ہوا ہے۔ خاکسار نے طوالت کے خوف سے نظر انداز کر دیا۔ مولانا ممدوح نے اپنے کلام کا مجموعہ مرتب کیا ہے۔ اس کے بعد خاکسار مولانا کی عربی شاعری پر مختصر طور پر کچھ عرض کرتا ہے۔

عربی شاعری۔

میں نے پہلے عرض کیا کہ مولانا کی عربی شاعری کی ابتدا دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ہوئی۔ اور اس کے بعد انہوں نے عربی میں کثرت سے کہا ہے بلکہ اُن کی شاعری کا اکثر حصہ سب عربی پر ہی مشتمل ہے۔ دارالعلوم سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ تدریس کے لئے باہر گئے تو علمی ماحول کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ جو کچھ کہتے اردو میں کہتے لیکن جب دارالعلوم میں مدرس ہو کر آئے تو یہاں پر اُن کو ایک اچھا علمی ماحول میسّر آگیا۔ عربی شاعری کی مجلسیں ہر طرف گرم تھیں اور عربی میں کہنے والے کثرت سے موجود تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی اور حضرت العلاّمہ مولانا کشمیری[۱] رحمۃ اللہ علیہما کی بلند پایہ شاعری ہر مجلس و ماحول میں پسند

---

[۱] اس موقع پر ایک واقعہ جس سے حضرت العلاّمہ امام العصر مولانا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی زود گوئی و پُر گوئی، استادانہ قدرت، شاعری سے گہری مناسبت اور شعر فہمی کا پتہ چلتا ہے تحریر کرتا ہوں۔ میں نے یہ واقعہ قاضی زین العابدین صاحب سجّاد میرٹھی سے سُنا ہے۔ قاضی صاحب کہتے تھے کہ جن دنوں حکیم اجمل صاحب دہلوی کا انتقال ہوا میں دارالعلوم دیوبند میں طالبعلمانہ زندگی گزار رہا تھا۔ حکیم صاحب کے سانحۂ موت پر مرثیہ کے طور پر چند اشعار میں نے لکھے۔ شائع کرانے کا ارادہ ہوا تو خیال ہوا کہ دارالعلوم میں اصلاح کے لئے کسی کو دکھا دوں

(باقی بر صفحہ ۹۱)

کیجا رہی تھی مولانا اعزاز علی صاحبؒ ان مجلسوں میں آکر شریک ہوئے تو اُنہوں نے کبھی عربی میں طبع آزمائی کی اور اپنا کلام مولانا عثمانی مرحوم اور امام العصر مولانا کشمیری کو اصلاح کے لئے دکھائے اس کے بعد مولانا ممدوح کو عربی میں کہنے کا شغف اس درجہ بڑھا کہ انہوں نے سنہ۱۳۰ھ میں مولانا میرک شاہ صاحب کشمیری (جو اُس وقت دارالعلوم میں مدرس تھے) کی تائید و جدوجہد سے دارالعلوم میں ایک انجمن نادیۃ الادب" کے نام سے قائم کی۔

نادیۃ الادب۔

اس انجمن کے عملی صدر امام العصر حضرت العلامہ مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ عام طور پر ذوق و شوق اور نہایت سرگرمی سے حصہ لینے والوں میں دارالعلوم کے تمام اکابر اساتذہ کے علاوہ طلبا بھی اپنا کلام پیش کرتے۔ اس انجمن کا اجلاس ہر جمعرات کو بعد عصر دارالعلوم کی مشہور عمارت "نودرہ" میں ہوتا۔ حضرت شاہ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ مجلس کے اختتام پر شعر کا اعلان فرماتے اور آئندہ جمعرات کو اُسی شعر پر طبع آزمائی کیجاتی۔ فرروی قرار دیا گیا تھا کہ پندرہ اشعار سے زیادہ نہ لکھے جائیں۔ حضرت مولانا عثمانی اور حضرت شاہ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہما بھی اپنا کلام مجلس اور حاضرین کو سُنا کر محظوظ کرتے۔ یہ انجمن بہت زمانہ تک

(بقیہ حاشیہ صفحہ۹۰) دارالعلوم میں اُس وقت مشہور تحریک شروع ہو چکی تھی کسی تعارف کے بغیر حضرت شاہ صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جا پہونچا۔ حضرت شاہ صاحبؒ اُس وقت کشمیر کے کسی معزز مہمان سے گفتگو کرنے کے علاوہ چند اخباری نمائندوں کو تحریک کے سلسلہ میں بیان دے رہے تھے۔ مصروفیت اور اس مشغولیت کے باوجود میں نے اپنا مرثیہ سامنے رکھدیا اسی وقت اصلاح فرمائی اور صرف الفاظ ہی میں تغیر و تبدل نہ کیا گیا بلکہ شعر کے شعر بدل ڈالے ۱۲ ؎

قائم رہی۔ اور اس میں حصہ لینے والی شاعری سے فطری مناسبت رکھنے والی طبیعتوں کی مفید تربیت ہوئی۔ اس کے بعد جب دارالعلوم میں "مشہور تحریک" شروع ہوئی تو دوسری علمی مجلسوں کے ساتھ یہ انجمن بھی برائے نام ہی رہ گئی۔

بہر حال مولانا اب بھی جبکہ آلام زمانہ اور فکر روزگار نے ان کی طبیعت کی رنگینیوں کو حسرت و یاس سے بدل کر بے کیف و رنگ کر دیا ہے کچھ کہہ لیتے ہیں لیکن بہت کم۔ ور خاص خاص موقعوں پر۔ بقول غالب مرحوم ؎

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی

پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

پچھلے دنوں مولانا ابوالکلام صاحب آزاد جب دارالعلوم آئے تھے تو مولانا اُن کی آمد پر ایک قصیدہ پڑھا تھا۔ عمر میں پہلی مرتبہ احقر کو مولانا کی زبان سے کلام سننے کا موقع ملا۔ اُن کے پڑھنے کا انداز عام شعرا کی طرح گلا پھاڑنا، آواز نمائی کرنا نہیں بلکہ وہ تحت اللفظ پڑھتے ہیں۔ اس کے باوجود اُن کی آواز میں ایک ... جاذبیت ہے، انداز سوز و گداز سے خالی نہیں۔

... مولانا کی عربی شاعری کا مختصر سا انتخاب اُن کے دیوان سے لے کر کرتا ہوں۔ ذیل میں آنے والے چند اشعار مولانا نے اُس وقت لکھے تھے جبکہ ... الادب" کے ایک جلسہ میں حضرت شاہ صاحب نے حماسہ کا مشہور شعر ؎

تمتع من شمیم عرار نجد

فما بعد العشیة من عرار

... فرمایا تھا۔ مولانا نے اس زمین، ردیف، قافیہ میں یہ چند اشعار مجلس میں

سُنا کر سب طرف سے تحسین حاصل کی تھی۔ ان اشعار کی اصلاح حضرت مولانا سیّد محمد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی۔

(۱)

تمتع من شمیم عرار نجد فما بعد العشیۃ من عرار

اُلام علی التجنّب والتخلی فقلت اجیبھم ھٰذا اشعاری

لقد طوفت فی الآفاق دھراً وجبت القفر والبید الصحاری

وجرّبت البلاد ومن علیھا ومیزت الصّغار من الکبار

فانی لم اجد احداً انصحنا یقینی من وقوعی فی عرار

ولا یغتابنی ان غبت عنہ ولا یؤذی اذا ھو فی جواری

رأیتھم عدوی فی البلایا واحبابی اذا انا ذو یسار

ولکن الکتاب کتاب علم سمیری فی اللیالی والنھار

یواسینی اذا ہجمت ھمومی ویونسنی اذا انا فی الدمار

خلیلی فی الھوا حسن الزوایا انیسی مونسی ھاھی الذمار

طریفی تالدی ورلیّ امری احبُّ ذخائری ولذا ادخاری

یذا فتح عسکر الاحزان عنی ویھدأنی اذا انا فی السھار

بہ سکری اذا ما شئت خمرا ومنہ افاقتی وبہ خماری

فھلّا ایھا اللوّام لُمتُم خلیّ القلب من قطف الثمار

ثمار فنون علم باجتھاد وتقریب لما یدنیہ داری

خمولی اطیب الحالات عندی	و اعزازی لدی ہمم فیہ عاری

(۳)

دار العلوم دیوبند کی مدح میں :-

دار العلوم بفیضہا المدرار	فاقت ضیاء الشمس نصف نہار
باق علی مرّ الزمان لاہلہ	من فیضہا الہطّال بحر جار
من جاء یستسقی بحار فیوضہا	یسقی بہا عللا بفتح الباری
زادت علی شمس السماء وبدرہا	نورا فلیس معارض ومبار
عادت تضیٔ ولیلہا کنہارہا	وتمیز الابرار من فجّار
تدعوا الی غفران رب غافر	وتصیر ترسا من عذاب النار
شہدت ملائکۃ الالٰہ بفضلہا	ودعت لہا الحیتان تحت بحار
روض حکت جنات عدن تحتہا الانہار للاخیار والاشرار	
ریا قرنفلہا یفوق ہبوبہا	ہبّ النسائم اول الابکار
وتضوّع الاکوان من فوحاتہا	نکأنہا زہر من الازہار
یحیی الاراضی کلہا نفحاتہا	کانت سہولا اوّ من الاوعار
ان زرتہا مازرت الا روضۃ	القا من القرآن والآثار
یتلی کتاب اللّٰہ فیہا دائما	وحدیث احمد سید الابرار
ان زرتہا مازرت الا رایۃ الاسلام والایمان المزوار	
ان زرتہا مازرت الا معدنا	للعلم علم نبینا المختار
شاہدتہا فرأیتہا مملوءۃ	من طالع خاش من القہار

ان زرتها ما زرت الا مزنة ... اجرت على الا وعار من انهار
ان زرتها ما زرت الا كوكبا ... يهدى الى الجنات للاخيار
فاعفر الهى من بناها مخلصا ... تاسيسها كبناء بيت البارى
ومدارسوها كلهم الا انا ... مثل النجوم هداية للسارى
شبانها شبان زهد والتقى ... وشيوخها غرر من الانوار
والعلم علم الدين دين محمد ... مقصودهم بالليل او بنهار
فيها رجال ليس تلهيهم تجارات ولا بيع عن الاستغفار
ذكر الاله طعامهم وشرابهم ... يتضرعون لكثرة الاذكار
جافت جنوبهم المضاجع ليلهم ... وتراهم يبكون بالاسحار
طمعا الى رضوان ربهم وخوفا من عذاب القادر الجبار
مثواهم حجر اتم تكنهم ... يسعرن مهما قيل من انصارى
شهدت بفضلهم النجوم على السما ... ما ان لهم من عائب او زار
قصرت مدائح السن عن فضلهم ... وحسودهم مستكثرا خبارى
ولهم فضائل لا تعد وكيف لا ... بذلوا نفوسهم اتقاء البارى
يارب اصلح حالنا ومالنا ... والحق بسيفك صولة الكفار
انزل بهم من كل شر شرة ... واحلل لهم خذلان ذى الاوزار
اوقد لهم نارا تحرق كلهم ... وتحيطهم كاحاطة التيار
وامح الذنوب صغيرها وكبيرها ... مما جناها العبد يا ستارى
وارحم الهى العبد اعزاز العلى ... حمال ذنب حامل الاوزار

وتزودی حُبّ النبی محمّدٍ ورجاء رب قادرٍ غفارٍ

(۳۲)

مرثیہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند۔

نعی الناعون شیخًا ذا حفاظ جلیلًا ماجدًا بالفضل احری

نبیلًا فاضلًا شهمًا ذکیًّا مطیعًا ربّه نهیًا وامرا

سلالة قاسم الخیرات ندبًا وفیًّا حائزًا اجرًا وذخرا

صبورًا فی المصائب والرزایا وفی السراء کان یزید شکرا

لعطشی العلم کالعسل المصفّی وللعلماء کان اجلّ بحرا

واعتق علمه اسراء جهلٍ سبی احسانه عبدًا وحُرّا

شهیدًا مات مغتربًا غریبًا فکلهم بحور الدمع اجری

فکم من اعینٍ قد بیّضتها دموعٌ قد جرت بیضا وحمرا

فقدنا قاسم الخیراتِ علمًا وزهدًا ثم تقوی ثم فقرا

ولکنا املین بان نراه یُخجّلُ وجههُ شمسا وبدرا

ویُمتعنا وسرود نظام مُلكٍ سمیّ خلیفتین اضاء دهرا

ملیكٍ عادلٍ یقظٍ ابیٍّ حبعثنهٍ نجیح فاق عصرا

له جود حکاه الغیث طورًا اذا استمطرته والبحر اخری

یحب الناس ماشاء وا ولکن له قلب ببیض المجد مغری

ملک نظام حیدرآباد نے دارالعلوم میں آنے کا وعدہ کیا تھا اس سلسلہ میں ضروری انتظامات کے لئے حافظ صاحب حیدرآباد سے دیوبند کا سفر کر رہے تھے۔

مطاع الخلق فی عسر و یسر — و مجری امره برًّا و بحرا

به یعلی علوم الدین عزًّا — به یسمی نظام الملک طرًّا

و لکنا سمعنا ان قدرًا — من الله العظیم لسدّ مجری

و لبّی داعی الله الذی لا — مَرَدَّ لهٗ و ان خدعًا و مکرا

له خُلدٌ و للخلد ام حزنٌ — رأینا موته خیرًا و شرًّا

فیا من همه دار العلوم التی اجریتها بحرًا و نهرا

سعیت لما بناه ابوک سعیًا — فحُزت الاجر ثم حویت برًّا

و لم یک فنک کالاهل دفنًا — علوم هُدًی فذ فنک ما امرًّا

حییت مجددًا و بقیت فردًا — و قد ترتبت شرکا ثم کفرا

بحدت عن الذی نافیه نصٌّ — و عما جاء ما فارقت شبرا

و قد اجریت بحر العلم منًّا — و قد اودعت فی الاکباد جمرا

بقینا هائمین بلا انیس — کانّا لم نجد خلا و خمرا

تعزینا اذا خطبٌ دهانا — بفقدک قد فقدنا الآن صبرا

تداوینا اذا جئناک مرضٰی — حیاری فی المسائل مثل سکریٰ

فیعطی ربنا جنات عدن — لاحمد فائق الاقران طرًّا

و قدس سره من فضل رب — رؤف واسع للعبد سترا

الٰهی فاسقِ من انهار خُلد — دفین اللحد احمد حاز قدرا

و عفوا عن ذنوب قد جناها — و صفحا عنه جاهرا و اسرّا

و ابو حبیب احسان قرونا — و قرنا بعدها و هلم جرا

م ۱۳۱۴ مجیب الرحمن صاحب عثمانی نائب مہتمم دار العلوم دیوبند

(۴)

سنہ ۱۳۴۹ھ میں حضرت مولانا نے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی مدظلہ العالی کی معیت میں زیارت حرمین شریفین زادہما اللہ شرفاً کی سعادت اندوزی کی تھی۔ روضۂ پاک سرور کائنات فداہ ابی وامی پر حاضری ہوئی تو یہ التجا ارتجالاً لکھی گئی۔

رسول اللہ جئتک مستجیرا ۔۔۔ علیک صلوٰۃ ربی والسلام

کئیبا مستغیثا مستحینا ۔۔۔ علی نفس تضیم ولا تضام

رسول اللہ جئتک مستجیرا ۔۔۔ وربی مستجیرک لا یضام

رسول اللہ جئت الیک ضیفا ۔۔۔ وحق الضیف تحرفہ الکرام

قدمت الیک مسکینا فقیرا ۔۔۔ وزادا لنفس آثام عظام

غریب جاء من ارض غریب ۔۔۔ ولیس لہ رفاق او ندام

ومسّتہ البلایا والرزایا ۔۔۔ یقلّبہ البساط فلا ینام

مریض اقلقتہ شئون نفس ۔۔۔ وقد ایست مداووہ وقاموا

لہ قلب ولا تحصی مناہ ۔۔۔ لہ ندم و لیس لہ کلام

واتعبنی طریق قد مشتنی ۔۔۔ ولم یبق اللحوم ولا العظام

وقد ضیعت عمری فی التلہی ۔۔۔ وفی الطغیان صار لی الدوام

وتجرحنی خطوب بعد خطب ۔۔۔ ویصمینی من الکرب السہام

رغبت الی معاص موبقات ۔۔۔ والہانی من الدنیا حطام

معاص قد حوت ساعات عمری ۔۔۔ فلا یخلو قعود او قیام

لقد انفقت مالی حب جاہ ۔۔۔ ریاء لی صلوٰۃ او صیام

هواى قد اتخذت الاه نفسى ... فما نفسى تريد هو المرام

واى جريمة لم ارتكبها ... فما لى عاصيا الا الملام

صحائف سيئاتى اثقلتنى ... الى من يستغيث به الانام

رسول الله خذ بيدى فانى ... جريح لا لجرحته التئام

رسول الله ملتجئا حزينا ... حضرت وفى الفؤاد ثوى ضرام

وَانت ابرّهم وَارق قلبا ... وَارعاهم اذا رقدوا وناموا

وَانتَ رسولهم جنا وَانسا ... وَانت لمن على الارض الامام

وانّك خير من ركب المطايا ... وقدرك ليس يدريه اللئام

وافضل من مشى فى الارض هونا ... واعظم من تعززه المقام

وَاجود من رياح مرسلات ... الى جدواك ان نظروا وشاموا

حريمك امن من كل هول ... وَبابك حوله عكف الانام

علوت مكانة من مدح نفسى ... عصىّ خائب فيها مرام

وارض قد رقدت بها رقودا ... يعظمها الملائكة الكرام

رسول الله فارحمنى فانى ... غريب هائم وولى الهيام

سقيتهم وقد جاءوك عطشى ... وهل انا راجع وولى الاوام

سقيتهم وقد جاءوك مرضى ... فهل انا راجع وولى العقام

اغثنى يا رسول الله انى ... لمغبون وقنطنى العظام

ترحمهم يا ابن امنة ترحم ... فمنى حولى رضاعى والفطام

بك استشفعت فى قلبى وكربى ... بك استشفيت اذ عرض السقام

مَلَاذِیْ اَنْتَ اِنْ هَجَمَ اللَّيَالِیْ — وَحِيْنَ قِتَالِهِمْ اَنْتَ الْحُسَامُ
اِنِ اسْتَغْفَرْتَ لِیْ مَوْلَایَ يَوْمًا — اَكُنْ مِمَّنْ عَلَى الدِّيْنِ اسْتَقَامُوْا
يُطِيْعُكَ مِثْلَ عَبْدٍ كُلُّ عُضْوِیْ — وَفِیْ قَلْبِیْ يَدُوْمُ لَكَ الْغَرَامُ

وَوَفِّقْنِیْ اِلٰهِیْ طُوْلَ عُمْرِیْ
اُصَلِّیْ بَاكِيًا وَّهُمْ نِيَامُ

میں نے پہلے عرض کیا ہے کہ مولانا کا اکثر کلام عربی میں ہے۔ خاکسار نے اُن کے ضخیم دیوان سے یہ مختصر سا انتخاب پیش کیا ہے۔ دیکھنے والے خود دیکھ سکتے ہیں کہ مولانا کے عربی کلام میں بھی اُن کے اُردو کلام کی طرح آمد بھی ہے اور انسجام بھی۔ برجستگی بھی ہے اور شستگی بھی۔ کلام میں نکھار بھی موجود ہے اور سوز و گداز بھی۔ اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطری طور پر شاعرانہ طبیعت لیکر آئے ہیں۔ اگر علم و فضل کی بندشیں مانع نہ ہوتیں اور شعر و شاعری علماء و فضلاء کے شایانِ شان ہوتی تو وہ بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ ع لکنت الیوم اشعر من لبید۔

وقارِ علمی، فضل و کمال کی بلند نشینی، شاعری کو پیشہ کی حیثیت سے اختیار نہیں کرنے دیتی۔ اسلئے مسند نشینِ فضل و کمال جو کچھ کہتے ہیں اُسکو عام طور پر سامنے لانے میں بہت تامّل کرتے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ تخیلات و اوہام کی وادیوں میں ٹھوکریں کھانیوالے واقعیت سے دُور، مبالغہ کے ہوائی قلعے قائم کرنے والے یقینِ علم اور علم الیقین کی جہاں افروز روشنیوں سے کب بہرہ یاب ہو سکتے ہیں۔ بہرحال میرا خیال ہے کہ مولانا اعزاز علی صاحب کی اردو شاعری کا علم پہلے پہلے اس خاکسار کے ذریعہ سے لوگوں کو ہوگا خود

خاکسار کو بھی آج تک اسکا علم نہ تھا کہ مولانا اُردو میں کچھ کہہ لیتے ہیں۔ اور حسن و عشق کی کشمکش، گُل و بلبل کی داستان، عشق کی نیاز مندیاں، حسن کی بے نیازی، چشم معشوق کی مستی، قدِ یار کا عالم، دل کی وارفتگی، شب ہجر کا سوز و گداز، معاملہ کی باتیں، حضرت مولانا شاعری یا عشق و عاشقی کے ان تمام اجزائے ترکیبیہ سے واقفیت رکھتے ہوں گے۔ لیکن شاید ع یہ قصہ ہے جب کا جب آتش جواں تھا۔ شیخوخت کے پیدا کردہ تقدس و تقویٰ نے مولانا کو اب ان گھاٹیوں میں اُترنے اور ان سنگلاخ راہوں کی جادہ پیمائی سے روک دیا ہے۔ امیر مینائی کیا خوب کہہ گئے ہیں۔ ؎

وہ کون ہے جو خرابات میں خراب نہ تھا
ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا

عام عادات و اخلاق

حضرت الاستاذ کی جامع شخصیت و گوناگوں خصوصیات سے بہرہ ورہستی کا اگر عقیدت و ارادت سے بالکل بالا ہو کر مطالعہ کیا جائے اور اُن کی مختلف شعبوں میں پھیلی ہوئی زندگی کے ہر گوشہ کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس مجموعۂ کمالات کی زندگی کا کونسا رُخ ہے جو تاریک ہو، اور کونسا پہلو ہی جس پر آفتاب کمال کی تابانیاں جلوہ فگن و عکس ریز نہ ہوتی ہوں۔

اس موضوع پر قلم اُٹھاتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ حسن صفات کے مجموعہ میں سے کسکو لیا جائے اور کونسا نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ زندگی کے مختلف گوشوں میں اگر کچھ تاریک ہوں اور اُن کے مقابل بعض روشن۔ تو تابناک پہلو کو نمایاں کیا جاتا ہے اور تاریک پہلو سے قطع نظر کیجاتی ہے۔ اور جہاں معاملہ بالکل ہی برعکس ہو یعنی خوبیوں اور اچھائیوں کے ساتھ بُرے پہلو موجود ہی نہ ہوں تو کیا لکھا جا سکتا ہے۔ تاہم سوانح نگار کی حیثیت سے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھنا ہی پڑیگا۔ کہنا یہ ہے کہ

خاکسار کو مولانا ممدوح کی زندگی میں سب سے زیادہ نمایاں وصف جو نظر آتا ہے اور وہ ان کی پوری زندگی پر حاوی و غالب ہے وہ اُن کی :-

انکساری و تواضع

ہے۔ اس پایہ کے عالم اور فقیہ ہونے کے باوصف اُن کے مزاج میں انکساری، فروتنی اور تواضع حد سے زیادہ پائی جاتی ہے۔ اپنے کمرہ سے درسگاہ جانے کے لئے جب وہ نکلتے ہیں تو راستہ میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ، ہر وہ مپیش آنے والے لوگوں کو بڑے نیازمندانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے نکل جائینگے۔ اکثر مواقع پر اسکی کوشش کی گئی کہ مولانا کی اس مخصوص روش و عمل میں ان پر سبقت کی جائے لیکن ایسا کرنے والے ہمیشہ ناکام رہے۔ وہ اپنے کمرہ سے نکلتے ہیں تو راستہ میں طلبار کے کپڑے، دوسری چیزیں جو طلبار کی روایتی غفلت و تساہل سے پڑی رہتی ہیں مولانا اُنکو اُٹھاکر سلیقہ کے ساتھ رکھتے چلے جائینگے۔ مولانا کی منکسرالمزاجی نے اُن میں یہ عجیب وصف پیدا کیا ہے۔ علمار کا بڑا ابتلا یہ ہوتا ہے کہ وہ کسی موقع پر کسی علمی مسئلہ کی نسبت اپنی لاعلمی یا قصورِ معلومات کا اظہار نہیں ہونے دیتے مگر حضرت شیخ الادب کی ذاتِ گرامی اس سے بالکل مستثنیٰ ہے۔ بارہا دیکھا کہ اگر کسی طالب علم نے اُن سے کسی ایسے مسئلہ میں تحقیق طلب کی جو اُس وقت اُن کو محفوظ نہ ہو یا اُس کے متعلق علم نہ ہو تو اس سلسلہ میں برملا وہ اپنی لاعلمی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ اسی طرح ہجومِ مشاغل، کثرتِ کار کی وجہ سے اگر کوئی بات زبان سے نکل گئی اور دوسرے اوقات میں طلبار نے متنبہ کیا تو وہ بلا تکلف تسلیم کر لینگے۔ غرضیکہ اپنی غلط بات کو صحیح تسلیم کرانے پر اصرار میں نے اُن کے یہاں نہیں دیکھا۔

بہرحال انکساری اور فروتنی مولانا کی تمام صفات میں سب سے زیادہ نمایاں صفت ہے اور یہی وصف مولانا کے لئے دلیلِ کمال ہے ؎

فروتنی است دلیلِ رسیدگانِ کمال — کہ چوں سوار بہ منزل رسد، پیادہ شود

شہرت سے نفرت

اس انکساری اور تواضع ہی کا نتیجہ ہے کہ وہ شہرت سے حد درجہ نفور رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ عام مجمعوں میں جب کبھی اُنکی تلاش ہوتی ہے تو حضرت مولانا اعزاز علی صاحب ہمیشہ سب سے الگ ایک گوشہ میں بیٹھے ہوئے پائے جائینگے۔ خمول وخلوت کی گمنامیوں کو مولانا نے جلوت ومجلس آرائی کی بخشی ہوئی عزتوں پر ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں ؎

خمولی أطيب الحالات عندی
واعزازی لديهم فيه عاری

مجکو آج تک کوئی ایسا موقعہ یاد نہیں کہ میں نے مولانا کو شہرت طلبی کے ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے دیکھا ہو۔ آجکل کے علمائے کے مزاج کے خلاف اُستاذ محترم کا یہ وصف قابل ذکر ہے۔ اپنے علم وفضل کی وجہ سے مولانا کو جو شہرت ملک میں نصیب ہوئی، عقیدت مند دنیا زکیش اس شہرت سے فائدہ اُٹھا کر اپنی عقیدت وارادت کا جب مظاہرہ کرتے ہیں تو مولانا کو ہمیشہ کہتے ہوئے سنا کہ ؎

مشہور ہیں دُنیا میں مگر ہوں بھی کہیں ہم
الغرض نہ درپئے ہو ہمارے کہ "نہیں ہم"

بغض وکینہ سے اجتناب۔

اُن کی زندگی کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ بغض کینہ، جہل وکپٹ اُن کے قلب میں بالکل نہیں۔ بار بار دیکھا گیا کہ وہ شخص جسنے مولانا کو سخت سے سخت اذیت پہونچائی، روحانی کوفت کا باعث بنا اور مسلسل مولانا کے درپئے آزار رہا، جب اُسنے آکر معذرت کردی تو پھر مولانا کا قلب اُسکی طرف سے بالکل صاف ہو جاتا ہے فطری طور پر ایسے مواقع پر مولانا کو غم وغصہ ضرور ہوتا ہے لیکن بڑا سریع الزوال اور جلد ختم ہو جانے والا۔ اُن کا مزاج انتقام در مخالفت کے جذبوں سے خالی ہے،

کسی کو نقصان پہونچائیں یا اُسکے درپے آزار ہو کر تخریب کی کوشش کریں ایسا جذبہ میں نے اُن میں نہیں پایا۔ طلبا کے ساتھ تو اُن کی شفقت کا یہ عالم ہے کہ طالب علم ہر قسم کی غلطی کرتا ہے، لغزش کھاتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ مولانا کی خدمت میں پہونچکر معذرت کے پورے الفاظ بھی ادا کرنے نہیں پاتا کہ مولانا فرمائینگے "مولوی صاحب جائیے بس میرا دل صاف ہوگیا، اپنا کام کیجیے۔" اور پھر واقعہ یہ ہے کہ اُن کا دل بالکل صاف ہوجاتا ہے اور کدورت کا تھوڑا سا غبار بھی ان کے صاف قلب پر باقی نہیں رہتا۔

احسان۔

خاکسار کو جب اس کا علم ہوا کہ حضرت الاُستاذ باوجود اپنی قلیل آمدنی، قلت مشاہرہ کے مستعد اور مستحق طلبار کے ساتھ حسن سلوک فرماتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ کم از کم یہ علم میرے لئے تو باعث حیرت تھا اس لئے کہ میں جانتا ہوں مولانا ممدوح کی معیشت زیادہ آسودہ نہیں اس کے باوجود مولانا کا طلبار کے ساتھ یہ طرزِ عمل اسلاف کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دارالعلوم کے طلبار اگر بیمار ہوتے ہیں تو مولانا ان کا علاج و معالجہ اپنی جیب خاص سے کرائینگے۔ دن میں کئی بار اُن کے کمرہ پر پہونچکر اُن کی عیادت کرینگے۔ مدرسے کی امداد بند ہوجاتی ہے تو اپنے صرفہ پر طلبار کے طعام و خوراک کا انتظام کیا جاتا ہے۔ بہرحال ان کی اب یہ چند خصوصیات مرنے والوں ہی کے تذکروں میں بیان کی جاتی ہیں۔ ورنہ اب جو ہیں اُن میں اس صفات کے حامل بہت کم ہیں۔

استغنا و خودداری۔

اہلِ علم و فضل کے مزاج کے بالکل برعکس میں نے مولانا میں بے نیازی، توکل صد درجہ پایا۔ ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں نے گرانقدر مشاہروں پر مولانا کو بار بار اپنے یہاں بلایا لیکن مولانائے محترم نے دارالعلوم کی قلیل تنخواہ کو چھوڑ کر گرانقدر مشاہروں پر جانا گوارا نہیں فرمایا۔ وہ کسی کے سامنے اپنی ضروریات کا اظہار کریں یہ تو بڑی بات ہے، لوگوں کے پیش کردہ تحائف و ہدایا کے

لینے میں بھی مولانا کو تامل ہوتا ہے۔ غالباً کہنے والے نے مولانا ہی کے لئے کہا ہے ؂

آگے کسو کے کیوں کریں دستِ طمع دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے

خاکسار خوب جانتا ہے کہ مولانا کی معاشرت آسودگی اور مرفہ حالی سے بہت دور ہے لیکن اس روشن ضمیر انسان نے قناعت واستغنا، توکل وبے نیازی اور خودداری کا پردہ کچھ اس طرح ڈالا ہے کہ مولانا کی گھریلو زندگی اور اُس کی الجھنوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ہاں ایسے صاحب فضل وکمال لوگوں کی زندگی، فکر معاش کی اُلجھنوں میں ہمیشہ اُلجھی رہتی ہے لیکن غیور طبیعتیں، خوددار مزاج کشمکش کے اُن تمام مراحل کو روشن دلی کی قوتوں سے طے کرتے ہیں ؂

روشن دلاں ہمیشہ بسختی بسر برند
در سنگ زندگی بسر آمد شرار را

مولانا کی معاشی اُلجھنوں سے واقف ہونے پر اگر کسی ارادت کیش نے مولانا کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہا بھی تو مولانا کی خودداری وقناعت نے ہمیشہ یہ جواب دیکر اُس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا کہ ع

آسماں گو فکر دیگر کن۔ کہ ما فارغ شدیم

میں نے پہلے عرض کیا کہ مولانا نے اپنی تصانیف وتالیفات پر کسی قسم کا معاوضہ نہیں لیا۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو اپنی ان تالیفات سے اچھا خاصا سرمایہ جمع کر سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ وہ سخت سے سخت موقعوں پر بھی اپنی خودداری کو ادنیٰ سی ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔ خاکسار کے خیال میں اس وصف میں بھی مولانا عام علماء سے ممتاز ہیں۔

متانت وسنجیدگی۔

علم کی جلالت وعظمت نے ان پر ایک خاص متانت وسنجیدگی طاری کر دی ہے وہ عام مجلسوں میں عامیانہ مذاق کرتے ہوئے کبھی نظر نہیں آتے۔ قہقہہ بازی اُن کے یہاں قطعی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ متبسم نظر آئیں گے۔ اُن کی شخصیت نہایت مرعوب کن ہے۔

اُن کے خداداد وقار و جلال میں " نصرت بالرعب " کا نمونہ نمایاں ہے۔

زہد و ورع۔

علم میں اشتغال و انہماک کیوجہ سے اگرچہ عبادت و ریاضت میں ان کی مشغولیت زیادہ نہیں لیکن اس کے باوجود وہ روشن ضمیر بھی ہیں۔ اور روحانی کیفیت سے خالی بھی نہیں۔ غالباً حضرت گنگوہی قدس سرہٗ سے اُن کو شرف بیعت حاصل ہے۔ اور اب سیدی و مرشدی حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی سے اجازت و خلافت ہے۔

ظرافت۔

اگرچہ علم کے اشتغال و انہماک نے ان پر متانت و سنجیدگی طاری کردی ہے۔ اور وہ نہایت خاموش پسند، خلوت گزین واقع ہوئے ہیں لیکن اس کے باوجود ذہانت و ذکاوت، جودت طبع اور لطافت مزاج نے اُن میں ایک خاص قسم کی ظرافت اور زندہ دلی پیدا کردی ہے۔ لیکن اُن کی ظرافت اور خوش طبعی کا رنگ لئے ہوئے اور سنجیدگی و وقار کے رنگ و روغن سے آراستہ ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے۔ جس کی تفصیل یہ ہے:۔

سیاسی مسلک کے اعتبار سے وہ اگرچہ ہمیشہ جمعیۃ العلمائے ہند کے ساتھ وابستہ رہے لیکن اپنی زندگی کو سیاسی مشاغل اور اُلجھنوں کے نذر کبھی نہ کرسکے۔ تدریس و تعلیم کی زبردست ذمہ داریوں نے وقتی مسائل میں مولانا کو حصہ لینے کا موقع نہیں دیا بلکہ طلبا کے لئے ایک حد تک وہ سیاست میں حصہ لینے کو اُن کی علمی زندگی کے لئے نہایت مضر اور مہلک سمجھتے ہیں۔ خاکسار ایک طویل عرصہ تک مولانا کی اس رائے سے اپنے کو متفق نہیں پاتا رہا۔ لیکن دارالعلوم کی سیاسی انجمنوں اور وقتی بکھیڑوں میں جزوی شرکت سے جو کچھ نقصان پہونچا اسکے بعد مولانا ممدوح کی اصابت رائے اور طویل تجربے کی تصدیق کرنا پڑتی ہے۔ بہرحال واقعہ یہ پیش آیا کہ دارالعلوم کے طلباء کی انجمن " جمعیۃ الطلباء " کے انتخابات ووٹنگ کے ذریعہ سے ہو رہے تھے۔ انتخابات ختم ہوگئے۔ اور ممبران کا چناؤ ہو چکا شب کو مولانا کے کمرے میں جب ایک صاحب مولانا کے سر پر مالش کر رہے تھے خاکسار

حاضر ہوا۔ مولانا نے مجھ سے مخاطب ہوکر دریافت فرمایا کہ " آپ کی جمعیۃ الطلبہ کے انتخابات ہو چکے؟ " عرض کیا گیا " جی ہاں " پھر پوچھا کہ " مولوی صاحب کتنے طلبار منتخب ہوئے ہیں؟ " اس پر جواب دیا گیا کہ " تیرہ طلبار کا انتخاب ہوا ہے " میرے اس جواب پر پہلو بدل کر ظریفانہ لب و لہجہ میں بولے کہ " خدا کا شکر ہے کہ ڈیڑھ ہزار طلبار کے ہجوم میں تیرہ ہی طالب علم احمق نکلے " اور ہلکے سے تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

خلوت پسندی۔

مولانا بے حد خلوت پسند اور گوشہ نشین واقع ہوئے ہیں۔ اکثر کمرہ میں اس طرح دکھائی دیں گے کہ کتاب اُن کے ہاتھ میں ہے اور مطالعہ میں مستغرق ہیں۔ اب کہ کبر سنی کی حدود میں داخل ہو چکے اور عمر بھی پچھتر کے لگ بھگ ہے لیکن اُن کا مطالعہ، اشتغالِ علمی کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ ایک زمانہ میں مطالعہ کی کثرت، خلوت پسندی، خمول کی زندگی سے ان کا شغف مشہور تھا۔ مولانا کی ان ہی ایام کی زندگی پر کچھ نکتہ چینیاں شروع ہوئیں تو تنگ آکر دو چند اشعار کہے تھے جن میں کا پہلا شعر یہ ہے ؎

الام علی التجنّب والتخلّی
فقلت اجیبھم ھٰذا اشعاری

مطالعہ

عرض کیا گیا کہ دار العلوم میں مولانا ممدوح کثرتِ مطالعہ، کتب بینی، درس و تدریس کی شبانہ روز کی مشغولیت میں منفرد ہیں۔ دار العلوم کی مدرسی کے ابتدائی دور میں اُن کی کثرت سے کتب بینی کا یہ عالم تھا کہ ایک، ایک ہفتہ مسلسل وہ قطعاً نہ سوتے تھے۔ اور شب و روز کتاب کے سوا کوئی اور چیز اُن کے ہاتھوں میں، آنکھ کے سامنے نظر نہ آتی تھی۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ خود حضرت مولانا نے بارہا مجھ کو سنایا

فرماتے تھے کہ :-

"امام العصر حضرت العلّامہ مولانا سیّد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو کسی ذریعہ سے اس کی اطلاع پہونچائی گئی کہ "اعزاز علی" ایک ایک ہفتہ متواتر کتاب دیکھتا رہتا ہے اور اس عرصہ میں رات اور دن آنکھ تک بند نہیں کرتا ، مسلسل بیداری کی وجہ سے اس کی صحت روز بروز گرتی جاتی ہے - حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کو جو خصوصی تعلق میرے ساتھ تھا اس اطلاع نے اُن کو بے چین کر دیا - اور مضطربانہ عالم میں شب کو بارہ بجے جبکہ کڑکڑاتی ہوئی سردی پڑ رہی تھی میرے کمرہ پر تشریف لائے - اُس وقت میں مطالعہ کر رہا تھا - اور واقعۃً بیداری کی مدت ایک ہفتہ سے زائد ہو رہی تھی - تند لب و لہجہ اور پوری ناگواری کے ساتھ فہمائش فرماتے ہوئے کتاب میرے ہاتھ سے لیکر رکھدی"

مولانا اس کے بعد فرماتے تھے کہ "شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تشریف لیجانے کے بعد چند منٹ تو حضرت شاہ صاحب کی اس فہمائش کا مجھ پر اثر رہا اور جب برداشت نہ ہو سکا تو کتاب لیکر پھر مطالعہ میں مستغرق ہو گیا"

میں عرض کر چکا ہوں کہ آج بھی حضرت مولانا کا یہی عالم رہے - اُن کا یہ معمولِ مطالعہ ، شوقِ کتب بینی ، اور اس سلسلہ میں اُن کی غیر معمولی جدوجہد ہم ایسے پست وزبوں ہمت نوجوانوں کے لئے عبرت انگیز ہے -

حضرت مولانا طالب علم کی طالبعلمانہ زندگی سے متعلق نظریات نہایت سخت رکھتے ہیں - وہ طالب علم کو سراپا جدوجہد ، سعی و کوشش کے میدان میں مسلسل تگ و دو کا خوگر دیکھنا چاہتے ہیں - آرام ، مسلسل آرام ، تن آسانی ، راحت کوشی یا راحت طلبی اور ان کے ساتھ طالبعلمی یہ دو ایسی متضاد چیزیں ہیں جو مولانا کے خیال کے مطابق آپس میں جمع نہیں ہو سکتیں -

ایک مرتبہ رمضان المبارک میں وہ اپنے کمرہ سے تشریف لے چلے۔ خاکسار ہمراہ تھا۔ دارالعلوم کے "احاطۂ دارجدید" میں پہونچے۔ تو طلباء کی ایک جماعت اس طرح بے خود پڑی سو رہی تھی کہ موسمی زہریلے مچھروں سے نجات پانے کے لئے مچھردانی کے مہین پردوں سے حفاظت کا انتظام کیا گیا تھا۔ مولانا نے ایک نظر اُٹھا کر دیکھا اور پھر ایک آہ سرد بھر کر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ " یہ طلباء اسقدر موتے ہیں کہ ان کو مچھروں کے کاٹنے کا احساس ہوتا ہے اگر یہ مسلسل کتاب دیکھتے رہیں اور اسکے بعد ذرا دیر آرام کریں تو پھر ان کو اس قدر گہری نیند آئے کہ بڑے سے بڑے حادثہ کی بھی خبر نہ ہو۔"

خاکسار اگر کبھی جمعہ کے روز کہ اُس دن دارالعلوم میں تعطیل رہتی ہے اُن کے یہاں حاضر ہو جاتا ہے تو وہ دیکھتے ہی فرماتے ہیں کہ " مولوی صاحب آپ گھوم رہے ہیں حالانکہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جمعہ کے روز بڑی فراغت کے ساتھ مطالعہ اور کتاب دیکھنے کا وقت میسر ہوتا ہے۔" خاکسار کو یاد ہے کہ حضرت مولانا نے عیدالفطر اور عید قرباں کے دن بھی اسباق پڑھائے ہیں۔ اور آج بھی اُن کا یہ عالم ہے کہ ماہ رمضان المبارک میں جب تمام اساتذہ اور طلباء آرام کرتے ہیں یا آرام کے لئے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں تو مولانا چند مخصوص طلباء کو باوجود روزہ کی تعب پیاس کی شدت، کمزوری، ضعف و نقاہت، کبرسنی کے پیدا کردہ امراض کے باوجود قرآن شریف کے محبوب مشغلہ کے علاوہ درسگاہ میں درس دے رہے ہیں۔ غرضیکہ مولانا کی زندگی نام ہے ایک مسلسل جدوجہد، عمل پیہم اور ہمیشہ کام کرتے رہنے کا۔

سادگی۔

حضرت مولانا مزاج کے بھی بہت سادہ واقع ہوئے ہیں۔ مزاج کی سادگی، اُن کے لباس سے بھی نمایاں ہے۔ عام علماء کی طرح عبا، قبا، جبہ و دستار مولانا کا لباس نہیں۔ اُن کے جسم پر کھادی کا ایک لمبا سا کرتہ، معمولی کھدّر کا پائجامہ، سر پر دوپلی ٹوپی۔ پاؤں میں نہایت معمولی قیمت کا جوتا، مولانا کا لباس یہ ہے۔ زرق و

برق پوشاک - قیمتی ملبوس میں نے مولانا کے جسم پر کبھی نہیں دیکھا - جسم کی زیبائش و آرائش
اُن کے یہاں پسندیدہ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اُن کے مزاج میں نفاست موجود ہے -

امانت و دیانت -

حضرت الاستاذ کی تمام حسنِ صفات میں سے ایک قابلِ قدر اور لائق اتباع خصوصیت اُن کی امانت و دیانت ہے۔ طلبا نے، دارالعلوم کی ہزار، ہزار بلکہ اس سے بڑی رقمیں اُن کے پاس بطورِ امانت رکھی رہتی ہیں - مولانا ان تمام امانتوں کی حفاظت، ادائیگی اس طرح سے فرماتے ہیں کہ وہ اُن ہی کا حصّہ ہے۔ ایک طویل عرصہ سے دارالعلوم کے سالانہ امتحانات کے وہ نگراں متعین کئے جاتے ہیں۔ سوالات کے پرچوں کی نگہداشت کامل احتیاط کے ساتھ جس طرح کرتے ہیں اس کی مثال بہت کم نظر آسکے گی - جوابات کے پرچوں کی جانچ، کامیابی اور ناکامیابی کے نمبرات کے دینے میں اُن کے یہاں کسی کی رو و رعایت مشکل ہے۔ آج کل کے فاسد ماحول اور بگڑے ہوئے معاشرہ میں مولانا کا یہ امتیاز قابلِ تقلید ہے -

حلیہ -

خداوند تعالیٰ نے حُسنِ سیرت کے ساتھ اُن کو حُسنِ صورت سے بھی نوازا ہے۔ قوی الجثہ، متوسط قامت، دوہرا بدن، صاف رنگ، شاداب چہرہ، آنکھوں میں ایک خاص چمک، چہرہ سے جلال و عظمت کے آثار نمایاں ہیں۔

اولاد و احفاد

حضرت مولانا کے اس وقت تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہیں۔ بڑے لڑکے مولوی قاری احمد میاں صاحب - دوسرے لڑکے مولوی رشید میاں صاحب جو اس وقت پاکستان کے کسی دینی مدرسہ میں مدرس ہیں۔ سب سے چھوٹے صاحبزادے مولوی ا۔ ف۔ از السلام صاحب۔ دارالعلوم کے فاضل اور اپنے والدِ محترم کے فرمانبردار بیٹے ہیں۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ان کو اپنے والدِ محترم کے صحیح خلف اور واقعی جانشین بنائے۔

اس کے علاوہ مولانا کے پوتے اور نواسے ہیں۔

حرفِ آخر

عادات و اخلاق کی اس مختصر سی تفصیل کے بعد عرض ہے کہ ایک ایسی سعید شخصیت جس کی عمر کا طویل ترین حصّہ اور بیشتر وقت علم کی اور دارالعلوم کی خدمت میں گذرا اسکی حیاتِ پاک کا یہ ایک مختصر اور ناقص مرقع ہے۔ حضرت الاستاذ کی حیاتِ پاک پر لکھنا یہ ایک ایسا کام تھا جسکے لئے کوئی جیّد اہلِ قلم اور پختہ کار مصنّف قلم اُٹھاتا۔ اتنے بڑے وسیع اور پھیلے ہوئے کام کے لئے شوق ہوا ایک دیوانہ کو، ایک ظلوم و جہول ہیچ میرز کو ع قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند۔ بہرحال میرے جذبات و عقیدت کے پھول کاغذ کے دامن میں جس حد تک آسکے میں نے پوری پوری جرأت کے ساتھ ڈالدیئے اور اب کہ میری کوتاہیِ ہمّت و قصورِ علم نے مجھے آگے بڑھنے سے روک دیا ہے تو میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ ع سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کے لئے۔

اس حکایتِ بے پایان کو بیان کرنے کے لئے خاموشی کی زبان اختیار کرتا ہوں۔

شعر

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم

حکایت بود بے پایاں بخاموشی ادا کردم

میں نے پہلے عرض کیا کہ اول تو اس کوتاہ بخت، ظلوم و جہول کو کچھ آتا جاتا نہیں اور میری بے بضاعتی و کم علمی پر وہ لوگ خود مطلع ہو جائیں گے جن کی نظر سے میری اس ہیچ و پوچ تحریر کی ایک سطر بھی گذریگی۔ تاہم جو کچھ ہے اور جتنا ہے وہ سب اسی بارگاہ سے ملا ہے۔ مجھے اس کا کھلے الفاظ میں اعتراف کرنا چاہیئے ع ترے گھر سے ملا جو کچھ ملا ہے۔

حضرت الاستاذ کے اس کوتاہ بخت پر علمی احسانات اس قدر ہیں کہ اگر اُن کا ذکر مختصر طور پر بھی کروں تو سلسلۂ گفتگو بہت دراز ہو جاتا ہے ع۔ محشر تلک کہوں اگر مختصر کہوں۔

میں اُن کی خدمت میں کس طرح پہنچا، ان سے کیا پڑھا، اور کس طرح پڑھایہ خود

اپنی جگہ پر ایک طویل داستان ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ اس "داستانِ بے ستون دکوہکن" کے بھی کچھ اجزا نذرِ احباب کروں لیکن کوتاہ قلمی اب آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ مگر اسقدر ضرور عرض کروں گا کہ ان کی جانب سے افادہ کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ اور انہوں نے اپنی کمالِ شفقت، بے پایاں کرم و عنایت سے افاضہ کی راہیں مجھ پر ہمیشہ کھلی رکھیں۔ لیکن میری کوتاہ بختی، جس طریقہ پر مجکو تہی دست دہنی دامن رکھنا چاہتی ہے اس پر اگر حساس دل و جگر خون ہو کر بہ جائیں تو کچھ بعید نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ فیضِ ساقی سے شکایت نہیں گلہ اپنے ظرفِ دل کی تنگی کا ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ؎

نیضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل، دریا طلب
تشنۂ دائم ہوں، آتش زیرِ پا رکھتا ہوں میں

ہاں یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ ع ۔ اُبھرنے ہی نہیں دیتی ہمیں بے مایگی دل کی۔

لیکن اسکے باوجود خدائے دوجہان کے بے پایاں فضل اور بے کراں رحمت پر یقین کامل نے قنوطیت و یاس کے ہلاکت خیز دریاؤں میں گم اور غرق ہونے سے محفوظ رکھا اور میں سابق کی طرح آج بھی اُسکی رحمت سے پُر اُمید ہوں۔ کیا عجب ہے کہ اُس کا فضل و کرم کسی وقت شاملِ حال ہو کر ایک بے مایہ انسان کو خاک سے اُٹھا کر کاخ پر پہونچا دیں۔ ع اُسے فضل کرتے نہیں لگتی بار۔

کرم و عطا میں جو تاخیر اُدھر سے ہو رہی ہے اُس سے میری طلب کی صدائیں دھیمی نہیں پڑ سکیں اسلئے کہ مجکو یقین ہے ؎

دستِ طلب بڑھائے جا، یونہیں صدا لگائے جا
اُس کے حریمِ ناز میں، دیر ہے، دھاندلی نہیں

سید محمد انظر شاہ کشمیری
۱۳ شوال المکرم سنہ ۱۳۷۲ھ۔ دار العلوم دیوبند

مطابق سنہ ۱۹۵۳ء